سدھارتھ

پورٹیبل ڈاکومنٹ فارمیٹ

عقیل عباس

(منڈی بہاؤالدین)

سدھارتھ

ہرمن ہیسے:
مترجم۔آصف فرخی:

قسط نمبر1

برھمن زادہ

مکان کے سائے میں، دریا کنارے کشتیوں کے پاس دھوپ میں، بید مجنوں اور انجیر کے درختوں کی چھاؤں میں خوبرو برہمن زادہ سدھارتھ اپنے دوست گووند کے ساتھ جوان ہوا۔ پوتر اشنان پر، بھینٹ چڑھاتے ہوئے اور دریا میں نہاتے ہوئے، اس کے دبلے کندھوں کو سورج نے سنولا دیا۔ جب وہ آم کے باغ میں کھیلتا، جب اس کی ماں گاتی، وہ اپنے باپ سے سبق پڑھتا یا گیانیوں کے ساتھ ہوتا تو اس کی آنکھوں میں سے سائے گزر جاتے۔

سدھارتھ کافی عرصے سے علماء کی گفتگو میں شریک ہوتا تھا۔ اپنے دوست گووند سے بحث کرتا اور اس کے ساتھ مل کر گیان دھیان کی مشق کرتا تھا۔ ابھی سے اسے معلوم تھا کہ شبدوں کا شبد ''اوم'' خاموشی سے سانس کھینچنے کے ساتھ من ہی من میں اور سانس چھوڑتے ہوئے پورے دھیان سے کس طرح ادا کیا جائے۔ اس کی پیشانی آتما کے اثر سے چمکنے لگتی۔ ابھی سے اسے پتا تھا کہ کس طرح اپنے وجود کی گہرائیوں میں لافانی آتما کو تلاش کیا جائے جو کائنات سے الگ نہیں تھی۔ اس کے باپ کا دل خوش تھا کہ بیٹا ذہین ہے اور علم کا پیاسا ہے۔ اسے اپنا بیٹا بہت بڑا عالم اور پنڈت بنتا نظر آتا، برہمنوں کا بھی راج کمار۔

اسکی ماں جب اسے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دیکھتی تو اس کا سینہ فخر سے بھر جاتا کہ قوی، خوبرو اور بانکا سجیلا سدھارتھ کس قدر وقار کے ساتھ اس کی تعظیم کر رہا ہے۔

جب سدھارتھ اپنی چوڑی پیشانی۔ بادشاہوں جیسی آنکھوں اور چھریرے بدن کے ساتھ شہر کی گلیوں سے گزرتا تو نوجوان برہمن زادیوں کے دلوں میں عشق ہلچل مچانے لگتا۔

اس کا دوست برہمن زادہ گووند اس سے سب سے زیادہ محبت کرتا۔ وہ سدھارتھ کی آنکھوں اور اس کی صاف آواز سے محبت کرتا تھا۔ وہ سدھارتھ کی چال اور اس کے اٹھنے بیٹھنے کے مکمل وقار سے محبت کرتا۔ وہ ہر اس چیز سے محبت کرتا جو سدھارتھ کرتا یا کہتا اور سب سے بڑھ کر وہ سدھارتھ کی دانش، اس کے بلند خیالات، اس کے مضبوط ارادے اور اسکی اعلیٰ صلاحیتوں سے محبت کرتا۔ گووند کو پتا تھا کہ وہ کبھی ان عام برہمنوں جیسا نہیں بن سکے گا جو چڑھاووں کے کاہل نگراں ہوتے ہیں، جادو کے الفاظ کا بیوپار کرتے ہیں، مغرور اور فضول مقرر ہوتے ہیں، مکار اور غیار پروہت ہوتے ہیں یا پھر بھیڑوں کے بڑے سے گلے میں محض ایک اچھی اور احمق بھیڑ ہوتے ہیں۔ نہیں وہ، گووند، دوسرے ہزاروں برہمنوں کی طرح نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سدھارتھ کی پیروی کرے، سدھارتھ جو محبوب تھا، سدھارتھ جو شان و شوکت والا تھا اور اگر کبھی سدھارتھ دیوتا بنا، اگر کبھی وہ نور کل میں داخل ہوا گووند اس کے پیچھے اس کا دوست، اس کا ساتھی، اس کا نوکر، اس کا نیزہ بردار اور اس کا سایہ بن کر چلنا چاہتا تھا۔ یوں سبھی سدھارتھ سے محبت کرتے۔ وہ ہر ایک کو خوش رکھتا ہے۔

مگر خود سدھارتھ خوش نہ تھا۔ انجیر کے باغ کی گلاب لگی روشوں پر ٹہلتے ہوئے، کنج کے نیلگوں سائے میں گیان میں مصروف ہو کر، روزانہ اشنان میں اپنے ہاتھ پیر دھوتے ہوئے، آم کے پیڑوں کے سائے میں پورے وقار کے ساتھ چڑھاوا چڑھاتے ہوئے وہ سب کا محبوب تھا، سب کی خوشی تھا مگر اس کے اپنے دل میں کوئی خوشی نہ تھی۔ سپنے اور بے چین کر دینے والے خیالات دریا سے، رات کو چمکنے والے ستاروں سے اور سورج کی پگھلتی شعاعوں سے بہہ کر اس تک آتے رہتے۔ سپنے اور روح کی بے چینی اس کے پاس بھینٹ کے دھوئیں سے اٹھ کر، رگ وید کے شبدوں سے ظاہر ہوتے اور بوڑھے برہمنوں کی سکشا سے ٹپکتے ہوئے اس کے پاس آتے۔

سدھارتھ اپنے اندر بے اطمینانی کا اکھوا پھوٹتے ہوئے محسوس کرنے لگا تھا، اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کے ماں باپ کی محبت اور اس کے دوست گووند کی محبت اسے ہمیشہ خوش نہ رکھ سکے گی، اسے شانتی نہ دے سکے گی۔ اسے اطمینان نہ دلا سکے گی۔ اسے شبہ ہونے لگا تھا کہ اس کے باپ اور دوسرے استادوں یعنی ان دانا اور عاقل برہمنوں نے اس تک اپنے علم کا اہم ترین اور بہترین حصہ پہنچا دیا تھا، انہوں نے اپنا پورے کا پورا علم اس کے منتظر ساغر میں انڈیل دیا تھا، لیکن یہ ساغر پھر بھی پورا نہ بھرا تھا، اس کی دانش کو سیری نہ ہوئی تھی، اس کی آتما کو شانتی نہ تھی، دل کو چین نہ تھا۔ روزانہ کے اشنان تھے تو بہت اچھے، مگر صرف پانی تھے۔ وہ پاپ کو نہیں دھو سکتے تھے، وہ مضطرب دل کو سکون نہیں دے سکتے تھے، دیوتاؤں کے لئے بھینٹ چڑھانا بہت عمدہ بات تھی مگر کیا وہ سب کچھ تھی؟ بھینٹ چڑھانے سے خوشی مل سکتی تھی؟ اور وہ دیوتا کیا تھے؟ کیا واقعی پرجاپتی نے کائنات تخلیق کی تھی؟ اس کو بنانے والا آتما

اورصرف آتما نہیں ہے؟ کیا دیوتا بھی میری اور تمہاری طرح فانی اور عارضی نہیں بنائے گئے؟ لہٰذا ان دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھانا کہاں کی عقلمندی تھی؟ کس کو بھینٹ چڑھائی جائے، کس کی عزت کی جائے سوائے اس ذات کے جو باطنی ہے، جو ابدی ہے اور جسے ہر شخص اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ ذات جو باطنی ہے، کہاں ہے؟ وہ گوشت پوست تو نہیں ہے اور نہ ہی وہ خیال اور احساس ہے۔ داناؤں نے یہی کہا تھا۔ پھر وہ کہاں تھی؟ ذات تک پہنچنا، آتما تک پہنچنا، کیا کوئی اور بھی راستہ ہے جس پر چلا جائے۔ کوئی نہ تھا جو یہ راستہ دکھائے، جو یہ راستہ جانتا ہو، نہ اس کا باپ نہ اس کے استاد اور دانا لوگ نہ ہی مقدس اشلوک، برہمنوں کو اور ان کی مقدس کتابوں کو سب کچھ معلوم تھا۔ انہیں ہر چیز کا علم تھا، اس دنیا کی تخلیق، کلام کی ابتداء کھانا پینا، سانس لینا، حواسوں کا اجتماع اور دیوتاؤں کے افعال، انہیں بہت ساری چیزیں معلوم تھیں لیکن ان سب معلومات کا کیا فائدہ تھا اگر ان کو سب سے اہم وہ بات معلوم نہیں تھی، جس کے علاوہ کوئی اور چیز اہم نہ تھی۔

مقدس کتابوں کے بہت سارے اشلوک خصوصاً سام وید کی اپنیشد اس کو اس اندرونی چیز کے بارے میں بتاتے ''تمہاری آتما ہی ساری دنیا ہے۔'' ان میں لکھا ہے کہ آدمی جب سو جاتا ہے تو وہ اپنے بھیتر پہنچ جاتا ہے اور آتما میں مقیم ہو جاتا ہے۔ ان اشلوکوں میں قوت اور زبردست دانش تھی۔ عاقلوں کا علم یہاں ایسی جادو بھری زبان میں لکھا ہوا تھا جیسے مدھ مکھی کا جمع کیا ہو شہد۔ علم اور دانشوری کا یہ مجموعہ جسے برہموں کی نسلوں نے جمع کیا اور محفوظ کیا تھا آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مگر کہاں تھے وہ برہمن، وہ پنڈت، وہ سیانے جنہیں محض اس سب کا علم ہی نہ تھا بلکہ جو اس کو محسوس کرنے میں کامیاب بھی ہوئے تھے؟ کہاں تھے۔ ابتداء کرنے والے لوگ جو نیند میں آتما کو حاصل کرنے کے بعد اپنے ہوش میں اپنی زندگی میں ہر چیز میں، قول میں اور عمل میں اسے قائم رکھ سکتے تھے؟ سدھارتھ بہت سے قابل قدر برہمنوں کو جانتا تھا اور سب سے بڑھ کر اس کا باپ جو پاکیزہ، دانش مند اور اعلیٰ ترین تعظیم کا مستحق تھا۔ اس کا باپ پسندیدگی کے لائق تھا، اس کے انداز میں خاموشی اور بزرگی تھی۔ اس کے باپ کی زندگی اچھی تھی، اس کے الفاظ میں دانش تھی، اعلیٰ اور عمدہ خیالات اس کے دماغ میں موجود تھے مگر کیا وہ بھی جو اتنا کچھ جانتا تھا، خوش تھا، شانت تھا؟ کیا وہ بھی بے چین نہیں تھا، راستہ نہیں ڈھونڈ رہا تھا؟ کیا وہ مسلسل مقدس چشموں تک اپنی بے چین پیاس کو لئے ہوئے نہیں جاتا تھا، اور چڑھاووں میں، کتابوں تک اور برہمنوں کے مناظروں میں نہیں جاتا تھا؟ کیا ضرورت تھی کہ وہ جس پر کوئی الزام نہ تھا اپنے پاپ دھونے جائے اور روزانہ نئے سرے سے اپنے آپ کو پوتر بنانے کی کوشش کرے؟ کیا آتما خود اس میں نہیں رہتی تھی؟ کیا وہ ماخذ خود اس میں موجود نہیں تھا؟ خود اپنے اندر اس ماخذ کو ڈھونڈنا چاہیے، اسے حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ باقی سب کچھ سراب کے پیچھے بھاگنا تھا۔

یہ تھے سدھارتھ کے خیالات یہ تھی اس کی پیاس، اس کا دکھ، وہ اکثر چندوگیہ اپنیشد کے شبد دہرایا کرتا: ''درحقیقت برہما کا نام ستیہ ہے، اور جو اسے جان لے وہ عالم بالا میں داخل ہو جاتا ہے۔ اکثر یہ عالم بالا بہت قریب نظر آتا مگر وہ اس تک نہ پہنچ پاتا، اپنی پیاس نہ بجھا پاتا اور ان تمام عاقلوں میں سے، جن کو وہ جانتا تھا اور جن کی تعلیمات سے بہرہ مند ہوتا تھا، کوئی بھی ایسا نہ تھا جو اس تک یعنی اس عالم بالا تک پوری طرح پہنچ سکا ہو۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جس نے اپنی ابدی پیاس بجھالی ہو۔

''گووند'' سدھارتھ نے اپنے دوست سے کہا، ''گووند، چلو میرے ساتھ برگد تلے گیان کے لئے۔''

وہ برگد کے پیڑ تک گئے اور ایک دوسرے سے بیس قدم دور بیٹھ گئے۔ اوم کا شبد دہرانے کے لئے بیٹھتے ہوئے سدھارتھ نے زیر لب پڑھا:

اوم ہے کمان اور آتما تیر ہے

برہما اسکا ہدف ہے

جس پر نشانہ لگانا ہے بے جھجکے

جب معمول کے مطابق گیان کا وقت پورا ہو گیا تو گووند اٹھا۔ شام ہو چکی تھی۔ شام کے اشنان کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے سدھارتھ کو نام لے کر پکارا۔ اس نے جواب نہ دیا۔ سدھارتھ گم بیٹھا تھا، اس کی آنکھیں کسی دور دراز انجانی منزل کو تک رہی تھیں اور اس کی زبان کی نوک دانتوں کے درمیان نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ دم سادھے بیٹھا ہے۔ وہ یوں گیان میں بیٹھا، اوم کے دھیان میں گم تھا اور اس کی آتما جیسے برہما کی سمت چلا ہوا تیر تھی۔

شام کو گیان کے وقت کے بعد سدھارتھ نے گووند سے کہا: ''میرے دوست کل صبح سدھارتھ سادھوؤں میں شامل ہونے جا رہا ہے۔ وہ جوگی بن جائے گا۔''

اپنے دوست کے یہ الفاظ سن کر اور اپنے دوست کے مصمم چہرے پر لکھا ہوا فیصلہ، جو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اٹل تھا، پڑھ کر گووند کا منہ سفید پڑ گیا۔ سدھارتھ کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی وہ جان گیا کہ ابتداء ہو چکی تھی۔

سدھارتھ اپنے راستے پر چلا جا رہا تھا، اور اس کی تقدیر ظاہر ہو رہی تھی اور اس کی تقدیر کے ساتھ گووند کی تقدیر بھی تھی۔ وہ کیلے کے سوکھے چھلکے کی طرح پیلا پڑ گیا۔

''مگر سدھارتھ''، اس نے کہا ''تمہارے باپ اس کی اجازت دے دیں گے؟''

سدھارتھ نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے ابھی ابھی نیند سے جاگا ہو۔ اس نے فوراً گووند کے من میں جھانک لیا، اس کی پریشانی کو جان لیا اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ راضی بہ رضا ہے۔

''ہم الفاظ ضائع نہیں کریں گے گووند۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''کل صبح پو پھٹے میں سادھو کی زندگی شروع کر دوں گا۔ ہم اس پر دوبارہ بحث نہیں کریں گے۔'' سدھارتھ اس کمرے میں گیا جہاں اس کا باپ چٹائی پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے باپ کی پشت پر چلا گیا اور کھڑا رہا جب تک کہ اس کے باپ کو اس کی موجودگی کا احساس نہ ہو گیا۔ ''یہ تم ہو سدھارتھ؟'' برہمن نے پوچھا۔ ''بتاؤ تمہارے من میں کیا ہے؟''

سدھارتھ نے کہا: ''آپ کی اجازت سے میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ کل میں آپ کا گھر چھوڑ دینا چاہتا ہوں اور یوگیوں میں شامل ہو جانا چاہتا ہوں۔ میں سادھو بننا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے باپ کو اس پر اعتراض نہ ہو گا۔''

برہمن اتنی دیر تک خاموش رہا کہ ستارے کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی سے ہو کر گزر گئے، ان کی ترتیب بدل گئی مگر کمرے کا سکوت نہ ٹوٹا۔ اس کا بیٹا ہاتھ باندھے خاموش اور بے حرکت کھڑا رہا۔ باپ خاموش اور بے حرکت چٹائی پر بیٹھا رہا اور ستارے آسمان سے گزرتے رہے۔ پھر اس کے باپ نے کہا: ''برہمنوں کے شایان شان نہیں کہ وہ تند اور غصیلے الفاظ زبان تک لائیں مگر میرے دل کو بہت رنج ہے۔ میں تمہیں یہ درخواست دوبارہ کرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔''

برہمن آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سدھارتھ ہاتھ باندھے خاموش کھڑا رہا۔

''تم کیوں انتظار کر رہے ہو؟'' باپ نے پوچھا

''آپ کو وجہ معلوم ہے۔'' سدھارتھ نے جواب دیا۔

اس کا باپ ناراض ہو کر کمرے سے چلا گیا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

جب ایک گھنٹہ گزر گیا اور وہ سو نہ سکا تو اٹھا اور اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا پھر گھر کے باہر نکل آیا۔ اس نے کمرے کی چھوٹی کھڑکی سے جھانکا اور دیکھا کہ سدھارتھ وہاں ہاتھ باندھے بے حرکت کھڑا ہے۔ وہ اس کے پیلے لباس کو جھلملاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ پریشان دل کے ساتھ وہ اپنے بستر پر واپس آ گیا۔

ایک گھنٹہ اور گزر گیا، وہ سو نہ سکا تو دوبارہ اٹھا، ادھر ادھر گھوما، گھر کے باہر آیا اور دیکھا کہ چاند نکل آیا ہے۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا۔ سدھارتھ وہاں بے حرکت کھڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور اسکی ننگی پنڈلیوں پر چاند کا عکس چمک رہا تھا۔ پریشان دل کے ساتھ وہ بستر پر لیٹ گیا۔

وہ ایک گھنٹے کے بعد پھر آیا اور دو گھنٹے کے بعد دوبارہ آ کر کھڑکی میں سے جھانکا اور سدھارتھ کو یونہی چاندنی میں، تاروں کی روشنی میں اور اندھیرے میں کھڑا دیکھا۔ وہ گھڑی گھڑی آ کر کمرے میں دیکھتا، اور سدھارتھ کو اسی طرح بے حرکت کھڑا پاتا۔ اس کا دل غصے سے چنتا سے ڈر اور دکھ سے بھر گیا۔

اور رات کی آخری گھڑی میں سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ دوبارہ آیا، کمرے میں داخل ہوا اور اس نوجوان کو کھڑے دیکھا۔ وہ اسے لمبا اور اجنبی لگا۔

''سدھارتھ'' اس نے کہا ''تم کیوں انتظار کر رہے ہو؟''

''آپ کو پتا ہے۔''

''تم یونہی کھڑے رہو گے اور انتظار کرتے رہو گے چاہے دن ہو جائے۔ دوپہر ہو جائے۔ شام ہو جائے؟''

''میں کھڑا رہوں گا اور انتظار کروں گا۔''

''تم تھک جاؤ گے سدھارتھ۔''

''میں تھک جاؤں گا۔''

''تم سو جاؤ گے سدھارتھ۔''

''میں نہیں سوؤں گا۔''

''تم مر جاؤ گے سدھارتھ''

''میں مر جاؤں گا۔''

''تو کیا تم اپنے باپ کا حکم ماننے کے بجائے مر جانا پسند کرو گے؟''

''سدھارتھ نے ہمیشہ اپنے باپ کا حکم مانا ہے۔''

''تو تم یہ خیال چھوڑ دو گے۔''

''سدھارتھ وہی کرے گا جو اس کا باپ کہے گا۔''

صبح کی پہلی کرن کمرے میں داخل ہوئی۔ برہمن نے دیکھا کہ سدھارتھ کے گھٹنے تھوڑے سے کپکپائے مگر سدھارتھ کے چہرے پر کپکپاہٹ نہ تھی۔ اس کی آنکھیں دور دراز کہیں دیکھ رہی تھیں۔ تب اس کے باپ کو احساس ہوا کہ سدھارتھ اب اس کے ساتھ گھر پر نہیں رہ سکتا۔ وہ تو اسے پہلے ہی چھوڑ چکا تھا۔

اس نے سدھارتھ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''تم جنگل میں جاؤ گے'' اس نے کہا'' اور سادھو بنو گے۔ اگر تمہیں وہاں چین مل جائے تو واپس آنا اور مجھے بھی سکھلانا۔ اگر تمہیں مایوسی ہو تو واپس آنا ہم مل کر دیوتاؤں کو بھینٹ چڑھائیں گے۔ اب جاؤ، اپنی ماں کو پیار کرو اور اسے بتاؤ کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ میرے لئے تو دریا کنارے جانے اور صبح کے اشنان کا وقت ہو گیا ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ بیٹے کے کندھے سے اٹھا لیا اور چل دیا۔ سدھارتھ نے چلنے کی کوشش کی تو اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ اس نے اپنے باپ کو سنبھالا، باپ کے سامنے جھکا اور ماں کو بتانے چل دیا۔

سن پیروں سے چلتا ہوا وہ دن نکلے پر سوتے ہوئے شہر سے گزرا تو آخری کٹیا سے ایک سایہ دبک کر نکلا اور مسافر کے ساتھ ہو لیا۔ وہ گووند تھا۔

''تم آ گئے۔'' سدھارتھ نے کہا اور مسکرایا۔

''میں آ گیا ہوں۔'' گووند نے کہا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر2

سنیاس

اس شام وہ دونوں سادھوؤں کے پاس جا پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ ان دونوں کی سنگت اور ان کی اطاعت کو قبول کرلیا جائے۔ انہیں قبول کرلیا گیا۔

سدھارتھ نے اپنے کپڑے راستے میں ایک غریب برہمن کو دے دیئے اور صرف اپنا جانگیہ اور بے سلا مٹیالے رنگ کا لبادہ اپنے پاس رکھا۔ وہ دن میں ایک دفعہ بھوجن کرتا اور اس نے غذا کو پکانا بالکل چھوڑ دیا۔

اس نے چودہ دن برت رکھا۔ اس نے اٹھائیس دن برت رکھا۔ اس کی ٹانگوں اور گالوں کا گوشت اڑ گیا۔ اس کی پھیلی ہوئی آنکھوں میں انجانے سپنے جھلملانے لگے۔ اس کی پتلی پتلی انگلیوں پر ناخن بڑھ کر لمبے ہو گئے اور اس کی ٹھوڑی پر چگی داڑھی نکل آئی۔

عورتوں سے جب اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہو اس کی نظریں برفیلی سی ہو جاتیں۔ وہ دھن ونت لوگوں کے شہر سے گزرتا تو اس کے ہونٹ تنفر سے سکڑ جاتے۔ وہ دیکھتا کہ تاجر تجارت کر رہے ہیں، راج کمار شکار کو جا رہے ہیں، نوحہ گر مردوں کو رو رہے ہیں۔ ویشیائیں اپنا آپ پیش کر رہی ہیں، وید بیماروں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں، برہمن فصل کی بوائی کے لئے شبھ لگن طے کر رہے ہیں، پریمی پریم کر رہے ہیں، مائیں اپنے بچوں کو بلا رہی ہیں، اور یہ سب کچھ ایک نگاہ غلط انداز سے زیادہ کا مستحق نہ تھا۔ یہ سب کچھ جھوٹ تھا، اس میں سے جھوٹ کی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ خوشی اور حسن دونوں ہی احساس کا دھوکا تھے۔ سب کے نصیب میں سڑنا گلنا لکھا تھا۔ دنیا کا ذائقہ کسیلا تھا۔ زندگی دکھ تھی۔

سدھارتھ کے سامنے ایک ہی مقصد تھا کہ وہ خالی ہو جائے، بھوک پیاس خواہش خواب دکھ سکھ سب سے خالی ہو جائے، اپنی ذات کو مر جانے دے۔ اس کا وجود نہ ہو اور وہ ہر چیز سے خالی دل کا سکون محسوس کر سکے، خیال محض کے خالص پن کو محسوس کر سکے..... یہ اس کا مقصد تھا۔ جب ذات پر فتح مل جائے اور اسے مار دیا جائے، جب ساری خواہشیں، سارے جذبے خاموش ہوں تب وہ آخری چیز جاگے گی، وجود کا وہ باطنی حصہ جو ذات سے متعلق نہیں ہے.....سربستہ راز!

سدھارتھ جلتے سورج کی تیز شعاعوں کے نیچے خاموش کھڑا تھا، وہ دکھ اور پیاس کا مارا ہوا تھا، وہ اس وقت تک کھڑا رہا جب تک اسکی پیاس اور دکھ مٹ نہ گئے۔ وہ بارش میں خاموش کھڑا رہا، پانی اس کے بالوں سے ٹپک کر اس کے یخ بستہ کندھوں سے ہوتا ہوا اس کے یخ بستہ کولہوں اور پیروں تک پہنچ جاتا۔ وہ تپسیا میں کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ اسکے کندھے اور پیر یخ بستہ نہ رہے، یہاں تک کہ وہ چپ ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ ساکت ہو گئے۔ وہ کانٹوں میں گھسا رہتا۔ اس کی جلتی ہوئی کھال سے خون ٹپکتا، ناسور پڑ جاتے اور سدھارتھ ساکت بے حرکت کھڑا رہتا۔ یہاں تک کہ خون نے بہنا بند کر دیا، یہاں تک کہ یہ چبھن باقی رہی نہ جلن۔

سدھارتھ سیدھا بیٹھا رہا اور اس نے اپنا سانس کھینچنے کا طریقہ سیکھا، اس نے سانسوں کو کم کرنا اور سانس روکنا سیکھا۔ اس نے سانس لیتے ہوئے اپنے دل کی دھڑکن کو خاموش رکنا سیکھا، اس نے دھڑکنوں کو اور کم کرنا سیکھا۔ یہاں تک کہ وہ کم ہوتے جاتے برائے نام رہ گئیں۔

سب سے معمر سادھو کی تعلیم سے سدھارتھ نے سمان تاعدے کے مطابق گیان اور آتم تیاگ سیکھا۔ بانس کے جنگل پر سے ایک بگلا اڑا اور سدھارتھ نے اس بگلے کو اپنی آتما میں لے لیا، جنگلوں اور پہاڑوں پر اڑا..... بگلا بنا، مچھلیاں کھائیں بگلے کی بھوک محسوس کی، بگلے کی بولی بولا، اور بگلے کی موت مر گیا۔ ساحل کی ریت پر ایک مردہ گیدڑ پڑا تھا۔ سدھارتھ کی آتما اس لاش کے جسم میں داخل ہو گئی۔ وہ مرا گیدڑ بن گیا، ساحل پر پڑا رہا، پھولا، سڑا، گلا، لکڑ بھگوں کے دانتوں سے چھیرا گیا، گدھ نے اسے نوچا، وہ ڈھانچہ بن گیا، خاک ہوا اور فضا میں مل گیا۔ پھر سدھارتھ کی آتما واپس آئی، مری سڑی، گلی، خاک ہوئی اور جنموں کے چکر کو جانا۔ وہ نئی پیاس کے ساتھ یوں منتظر رہتا جیسے اوٹ کے پیچھے شکاری کہ کب جنم کا چکر ختم ہوتا ہے، اسباب کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے اور کہاں پر دکھ سے عاری ابدیت شروع ہو جاتی ہے۔ اس نے اپنے حواس کو ختم کیا، اس نے اپنی یادداشت کو مار ڈالا اور وہ اپنی ذات سے نکل کر ہزاروں صورتوں میں آتا۔ وہ جانور، لاش، پتھر، لکڑی، پانی ہوتا اور ہر بار دوبارہ جاگتا۔ سورج یا چاند چمکتے ہوتے تو وہ پھر سے ''ذات'' بن جاتا، جیون کے چکر میں دوبارہ داخل ہوتا، پیاس محسوس کرتا، اس پر فتح پاتا اور پھر نئی پیاس محسوس کرتا۔

سدھارتھ نے سادھوؤں سے بہت کچھ سیکھا، اس نے ان سے ذات کی نفی کے بہت سے طریقے سیکھے۔ وہ درد سے گزر کر، اپنی مرضی سے دکھ اٹھانے اور درد پر قابو پانے کے عمل سے گزر کر، بھوک پیاس اور تھکن سے گزر کر نفی ذات کے راستے پر چلتا رہا۔ وہ گیان کے ذریعے اپنے تن کو تمام شکلوں سے خالی کر لینے کے ذریعے نفی ذات کے

راستے پر چلتا رہا۔ ان راستوں پر اور ان کے علاوہ دوسرے راستوں پر چلنا اس نے سیکھا ..... اس نے ہزار بار اپنی ذات کو کھویا اور دنوں تک غیر وجود کی کیفیت میں رہا حالانکہ وہ راستے ذات سے دور لے جانے والے تھے مگر بالآخر یہ اسے ذات تک ہی لے آتے۔ حالانکہ سدھارتھ ہزاروں بار ذات سے بھاگا، جانور اور پتھر بن کے جیا، اس کی واپسی یقینی تھی۔ وہ گھڑی یقینی تھی جب وہ اپنے آپ کو سورج کی دھوپ میں یا چاندنی میں، سائے میں یا بارش میں دوبارہ پالیتا اور دوبارہ ذات بن جاتا، دوبارہ سدھارتھ بن جاتا، دوبارہ سے جیون کے چکر میں پھنس جاتا۔

اس کے ساتھ اس کا سایہ گووند تھا۔ وہ بھی اسی راستے پر چلتا وہی کوشش کرتا۔ اپنی ریاضت اور خدمت گزاری کی ضروریات کے علاوہ وہ دونوں شاذ و نادر آپس میں بات کرتے۔ کبھی کبھی وہ اپنے لئے اور اپنے استادوں کے لئے کھانے کی بھیک مانگنے دیہاتوں میں جاتے۔

''تمہارا کیا خیال ہے گووند؟'' سدھارتھ نے ایک ایسے سفر پر جاتے ہوئے پوچھا، ''کیا تمہارے خیال میں ہم آگے بڑھے ہیں؟ کیا ہم اپنی منزل تک پہنچ گئے ہیں؟''

گووند نے جواب دیا: ''ہم نے سیکھا ہے اور ہم ابھی تک سیکھ رہے ہیں۔ تم بہت بڑے سادھو بنو گے سدھارتھ۔ تم نے ساری مشقتیں جلدی سیکھ لی ہیں۔ بوڑھے سادھو اکثر تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ ایک دن تم بڑے یوگی بنو گے سدھارتھ۔''

سدھارتھ نے کہا: ''میں تو ایسا نہیں سمجھتا، میرے دوست، اب تک میں نے سادھوؤں سے جو کچھ سیکھا ہے وہ تو میں زیادہ آسانی سے اور زیادہ تیزی سے کسی رنڈی کے کوٹھے پر اور جواریوں میں رہ کر سیکھ سکتا تھا۔''

گووند نے کہا: ''سدھارتھ مذاق کر رہا ہے۔ بھلا گیان دھیان، دم سادھ لینا، دکھ درد اور بھوک سے بے حسی تم ان کمینوں سے کیسے سیکھ سکتے تھے؟''

اور سدھارتھ نے ہولے سے کہا، جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہا ہو: ''گیان کیا ہے؟ آتم تیاگ کیا ہے؟ برت کیا ہیں؟ دم سادھ لینا کیا ہے؟ یہ سب ذات سے فرار ہے، یہ سب ذات کے کرب سے عارضی گریز ہے۔ یہ زندگی کے درد اور حماقت سے عارضی تسکین ہے۔ بیل ہانکنے والا سرائے میں بیٹھ کر جب چاول کی شراب یا ناریل کے دودھ کے پیالے چڑھاتا ہے تو وہ بھی یہی راستہ اختیار کرتا ہے، یہی دوا استعمال کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی ذات کو محسوس نہیں کرتا، زندگی کا درد محسوس نہیں کرتا۔ پھر اسے عارضی فرار کا احساس ہوتا ہے۔ جب وہ چاول کی شراب پی کر سو جاتا ہے تو اسے وہی کچھ مل جاتا ہے جو سدھارتھ اور گووند کو اس وقت ملتا ہے جب وہ بھاری تپسیا کے بعد اپنے بدن سے فرار پاتے ہیں اور غیر ذات میں مقیم ہو جاتے ہیں۔''

گووند نے کہا: ''تم یوں کہتے ہو، میرے دوست، مگر تمہیں پتا ہے کہ نہ تو سدھارتھ بیل ہانکنے والا ہے اور نہ ہی سادھو شرابی ہیں۔ بلاشبہ شرابی کو فرار حاصل ہو جاتا ہے، اسے ذرا دیر کی فراغت اور آرام مل جاتا ہے مگر جب وہ اس شراب سے ہوشیار ہوتا ہے تو اسے ہر چیز دوبارہ پہلے جیسی ملتی ہے۔ اسے دانائی حاصل نہیں ہوتی، اور علم حاصل نہیں ہوتا، وہ آگے تو نہیں گیا ہوتا۔''

سدھارتھ نے جواب دیا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''مجھے نہیں معلوم میں کبھی شرابی نہیں رہا مگر میں یعنی سدھارتھ اپنے تمام گیان دھیان اور تپسیا میں محض تھوڑی سی تسکین ہی حاصل کر سکتا ہوں، دانائی اور مکتی سے میں اتنا دور ہوں جیسے ماں کی کوکھ میں بچہ، ہاں گووند مجھے اتنا ضرور معلوم ہے۔''

ایک اور موقعے پر جب سدھارتھ گووند کے ساتھ اپنے ساتھیوں اور استادوں کے لئے بھیک مانگنے جنگل میں سے چلا تو سدھارتھ یوں کہنے لگا: ''ہاں تو گووند کیا ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں؟ کیا ہمارے علم میں اضافہ ہو رہا ہے؟ کیا ہم مکتی کی جانب بڑھ رہے ہیں، یا پھر ہم دائروں میں گھوم رہے ہیں۔۔۔۔ ہم، جنہیں جگروں سے فرار سکوں گیا تھا؟''

گووند نے کہا: ''ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے سدھارتھ۔ پھر بھی ہم میں کچھ سیکھنا باقی ہے۔ ہم دائروں میں نہیں گھوم رہے ہیں؟ ہم اوپر جا رہے ہیں۔ ہمارا راستہ چکردار ہے، ہم کئی سیڑھیاں اوپر جا چکے ہیں۔''

سدھارتھ نے جواب دیا: ''تمہارے خیال میں ہمارا قابل قدر گرو، وہ سب سے بوڑھا سادھو کتنا بوڑھا ہے؟''

گووند نے کہا: ''میرے خیال میں وہ ساٹھ کے پیٹے میں ہوگا۔''

اور سدھارتھ نے کہا: ''وہ ساٹھ برس کا ہے اور پھر بھی اسے نروان حاصل نہیں ہوا۔ وہ ستر برس کا ہوگا اور پھر اسی سال کا ہو جائے گا، اور میں اور تم، ہم بھی اس جتنے بوڑھے ہو جائیں گے، ہم تپسیا کریں گے۔ برت رکھیں گے۔ گیان دھیان کریں گے مگر ہمیں نروان نہ ملے گا، اسے نہ ہمیں۔ گووند مجھے وشواس ہے کہ ان سادھوؤں میں سے کوئی بھی نروان حاصل نہ کر سکے گا۔ ہم بہانے ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے ترکیبیں نکال لیتے ہیں مگر جو اصل چیز ہے، جو راستہ ہے، وہ ہی نہیں ملتا۔''

''اتنے خوفناک الفاظ تو منہ سے نہ نکالو۔'' گووند نے کہا۔''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اتنے سارے عالموں، اتنے سارے برہمنوں، اتنے سارے قابل احترام سادھوؤں، برہمچاریوں، اتنے سارے ڈھونڈنے والوں، باطنی زندگی کے عارف لوگوں میں سے، اتنے سارے نیک لوگوں میں سے کوئی بھی راستہ نہ ڈھونڈ پائے گا؟''

مگر سدھارتھ نے کہا، اور اسکی آواز میں جتنا دکھ تھا اتنی ہی تضحیک تھی، اس نے اپنی ہلکی کچھ دکھ بھری اور کچھ مذاق اڑاتی آواز میں کہا:''گووند، جلد ہی تمہارا دوست سادھوؤں کا راستہ چھوڑ دے گا جس پر وہ تمہارے ساتھ اتنے دنوں سے چل رہا ہے۔ میں پیاس کا مارا ہوں گووند، اور سادھنا کے اتنے لمبے راستے پر چلتے ہوئے میری پیاس کم نہ ہوئی۔ مجھے ہمیشہ علم کی پیاس رہی ہے، میرا من ہمیشہ سوالوں سے بھرا رہا ہے، سال بہ سال میں نے برہمنوں سے سوال کئے ہیں، سال بہ سال میں نے مقدس ویدوں سے سوال کئے ہیں، لیکن گووند اگر میں نے گینڈے یا لنگور سے سوال کئے ہوتے تو شاید اتنا ہی اچھا ہوتا۔ اتنی ہی عقلمندی ہوتی۔ میں نے فقط اتنی سی بات سیکھنے میں اتنا عرصہ لگا دیا جو ابھی تک پورا بھی نہیں ہوا، گووند، کہ آدمی کچھ بھی نہیں سیکھ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر شے کے جوہر میں ایسی چیز ہے جسے ہم علم نہیں کہہ سکتے۔ میرے دوست علم صرف ایک ہے جو ہر جگہ ہے جو آتما ہے جو مجھ میں اور تم میں اور ہر شے میں ہے، اور مجھے یقین ہو چلا ہے کہ اس علم کا سب سے بڑا دشمن نام نہاد عالم ہے۔''

یہ سن کر گووند راستہ چلتے رک گیا اور ہاتھ اٹھا کر بولا:

''سدھارتھ اپنے دوست کو ایسی باتوں سے پریشان نہ کرو۔ سچ کہتا ہوں کہ تمہاری باتوں سے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ ذرا سوچو تو پھر تمہاری دعاؤں کا کیا مطلب ہوگا، برہمنوں کی توقیر اور سادھوؤں کی پاکیزگی کے کیا معنی ہوں گے اگر بقول تمہارے کوئی علم نہیں ہے۔ سدھارتھ پھر کیا ہوگا، سب چیزوں کا کیا حشر ہوگا، اس دنیا میں پاک کون ہوگا، گراں بہا کون ہوگا اور مقدس کیا ہوگا؟

گووند نے کسی اپنیشد کا شلوک زیر لب پڑھا:

''جس کی متلاشی آتما پر ماتما سے مل جاتی ہے۔ اسے ناقابل بیان خوشی ملتی ہے۔''

سدھارتھ خاموش رہا۔ وہ دیر تک گووند کے الفاظ پر غور کرتا رہا۔

ہاں، سر جھکائے وہ سوچ رہا تھا، ہم جس کو پاک سمجھتے ہیں اس میں سے کیا باقی رہ جاتا ہے؟ کیا محفوظ رہ جاتا ہے؟ اور اس نے سر ہلایا۔۔۔۔

ایک دفعہ جب دونوں نوجوانوں کو سادھوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے اور ان کے ساتھ ریاضت کرتے ہوئے تین برس ہو چکے تھے تو انہوں نے کئی ذرائع سے ایک اطلاع، ایک افواہ سنی، کوئی شخص ظاہر ہوا تھا جس کا نام گوتم تھا۔ جو عالی مرتبت تھا جو بدھ تھا۔ اس نے اپنی ذات میں دنیا کے تمام دکھوں پر فتح پالی تھی اور اس نے جنموں کے پھیر کو اپنے واسطے روک لیا تھا۔ وہ سارے ملک میں پرچار کرتا پھرتا، اس کے گرد پیروکاروں کا جمگھٹا تھا، اس کی کوئی ملکیت نہ تھی، وہ بے گھر تھا۔ اس کی کوئی بیوی نہ تھی، وہ سادھوؤں والا گیروا جوڑا پہنے رہتا، اس کی جبین روشن تھی، وہ بزرگ تھا۔

اور بڑے بڑے راج کمار اور برہمن اس کے آگے جھکتے اور اس کے شاگرد بن جاتے۔ یہ اطلاع یہ افواہ یہ کہانی ہر جگہ سنی جاتی اور چاروں طرف پھیل جاتی۔ شہر کے براہمن اور جنگل کے سادھو اس کے بارے میں بات کرتے۔ گوتم بدھ کا نام نوجوانوں کے کانوں میں مستقلاً پہنچتا رہتا۔ کبھی اس کا ذکر عزت کے ساتھ ہوتا تو کبھی برائی سے، کبھی اس کی تعریف کی جاتی اور کبھی تحقیر۔

جس طرح جب کسی ملک میں طاعون پھیلتا ہے اور افواہ بلند ہوتی ہے کہ ایک ایسا آدمی ہے، دانا آدمی، عالم آدمی جس کے شبد اور جس کا سانس بیماروں کو ٹھیک کرسکتا ہے اور جیسے جیسے یہ اطلاع سارے ملک میں پھیلتی ہے اور سب میں اس کا چرچا ہوتا ہے تو کوئی اس پر یقین کرتا ہے اور کوئی اس پر شک کرتا ہے۔ بہت سے لوگ فوراً کمربستہ ہو جاتے ہیں اور اس دانا آدمی، اس محسن اور مربی کو ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح گوتم بدھ کے بارے میں، جو شاکیہ کی نسل میں سے تھا، یہ افواہ یہ خوشخبری ملک بھر میں پھیلنے لگی۔ اس کے ماننے والوں نے کہا: وہ دانا ہے، اسے اپنے پچھلے جنم یاد ہیں، اسے نروان مل چکا ہے اور وہ کبھی جیون کے چکر میں لوٹ کے نہیں آیا، وہ عالم ہیئت کے دکھ میں واپس نہیں آیا۔ اس کے بارے میں بہت ساری حیرت انگیز اور ناقابل یقین باتیں بیان کی جاتیں کہ اس نے معجزے دکھائے، اس نے شیطان کو تابو میں کیا، اس نے دیوتاؤں سے کلام کیا۔ مگر اس کے دشمن اور اس پر شک کرنے والے کہتے کہ یہ گوتم دھوکے باز تھا۔ اس نے اپنا وقت عیش وعشرت میں گزارا تھا، وہ بھینٹ اور چڑھاوے کا مذاق اڑاتا تھا، وہ بے علم تھا۔ اور اسے جسمانی ریاضت کا کچھ پتہ نہ تھا۔

بدھ کے بارے میں افواہیں بہت پرکشش معلوم ہوتی تھیں، ان افواہوں میں سحر تھا۔ دنیا میں دکھ کی بہتات تھی۔ زندگی مشکل تھی۔ جب کہ ان افواہوں میں نئی امید تھی، ان میں نیا پیغام تھا جو تسلی بخش تھا، جس میں حلم اور نرمی تھی، جس میں خوش آئند وعدے تھے۔ ہر جگہ بدھ کے بارے میں افواہیں گرم تھیں۔ گاؤں میں یا شہر میں کوئی بھی یاتری کوئی بھی اجنبی جو شاکیہ منی کی، اس شتھاگت کی خبر لاتا تو برہمن زادوں میں اس کا سواگت ہوتا۔

یہ افواہیں جنگل میں سادھوؤں کے درمیان گووند اور سدھارتھ تک تھوڑی تھوڑی کر کے پہنچیں، اور ہر خبر کے ساتھ امید بھی بندھی ہوتی اور نراس بھی۔ وہ اس کے بارے میں بہت کم بات کرتے کہ بزرگ ترین سادھو اس خبر سے راضی نہیں تھا۔ اس نے سنا تھا کہ یہ نام نہاد بدھ پہلے سادھو تھا اور جنگلوں میں رہتا تھا، پھر عیش وعشرت اور دنیا کی لذتوں کو لوٹ گیا، اس لئے وہ گوتم کی دلالت نہیں کرتا تھا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر3

''سدھارتھ'' گووند نے ایک دن اپنے دوست سے کہا'' آج میں گاؤں میں تھا تو ایک برہمن نے مجھے اپنے گھر بلایا اور اس برہمن کے گھر اس کا بیٹا تھا جو مگدھ سے پلٹ کے آیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے بدھ کو دیکھا تھا اور اس کو پرچار کرتے سنا تھا۔ سچ مچ میرا دل خواہش سے بھر گیا اور میں نے سوچا کہ کاش سدھارتھ اور میں وہ دن دیکھیں جب ہم اس مہاتما کے ہونٹوں سے خود اس کی سکشا سنیں۔ میرے دوست کیوں نہ ہم وہاں جائیں اور بدھ کے ہونٹوں سے سکشا سنیں؟''

سدھارتھ نے کہا:'' میں تو ہمیشہ سے یہ سمجھتا تھا کہ گووند سادھوں کے ساتھ رہے گا۔ مجھے ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ اس کا مقصد یہی ہے کہ ساٹھ ستر برس کا ہو جائے اور وہی کام کئے جائے جو سادھو سکھاتے ہیں مگر مجھے گووند کے بارے میں کتنا کم علم تھا! مجھے کیا پتہ تھا کہ اس کے من میں کیا ہے! اور اب میرے پیارے دوست تم نئے راستے پر چلنا چاہتے ہو اور جا کر بدھ کی باتیں سننا چاہتے ہو۔''

گووند نے کہا:'' تم میرا مضحکہ اڑا کر خوش ہوتے ہو۔ کوئی بات نہیں سدھارتھ۔ کیا تمہارے اندر اس کو سننے کی لگن اور خواہش پیدا نہیں ہوتی؟ اور کیا تم نے خود ایک دفعہ مجھ سے نہیں کہا تھا کہ میں سادھوؤں کے راستے پر اب زیادہ عرصے نہیں چلوں گا؟''

پھر سدھارتھ اس طرح ہنسا کہ اس کی آواز میں ہلکا سا دکھ اور ہلکا سا مضحکہ شامل تھا اور اس نے کہا:'' تم نے ٹھیک کہا گووند، تمہیں صحیح یاد تھا مگر تمہیں یہ بھی تو یاد ہوگا کہ میں نے تمہیں کچھ اور بھی بتایا تھا ..... یہ کہ میں ساری تعلیمات پر شبہ کرنے لگا ہوں اور مجھے ان الفاظ پر کم ہی یقین ہے جو استادوں کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ مگر ٹھیک ہے میرے دوست، میں اس نئی تعلیم کو سننے کے لئے تیار ہوں حالانکہ مجھے یقین ہے کہ ہم اس کا پھل چکھ چکے ہیں۔''

گووند نے جواب دیا:'' مجھے خوشی ہے کہ تم مان تو گئے۔ مگر یہ بتاؤ کہ گوتم کی باتیں بھلا کس طرح اپنا پھل ہمارے سامنے پیش کر سکتی ہیں جب کہ ہم نے اس کا نام ہی سنا ہے؟''

سدھارتھ نے جواب دیا:'' چلو ہم اس پھل سے لطف اندوز ہوں اور آئندہ کے پھلوں کا انتظار کریں گووند۔ یہ پھل جس کے لئے ہم پہلے ہی گوتم کے احسان مند ہیں۔ دراصل یہ حقیقت ہے کہ وہ ہمیں سادھوؤں سے دور کھینچ کر لے جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے اور اس سے بہتر پھل ہیں یا نہیں اس کا ہم صبر کے ساتھ انتظار کئے لیتے ہیں اور دیکھ لیتے ہیں۔''

اسی دن سدھارتھ نے سب سے بڑے سادھو کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کر دیا کہ وہ انہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس نے بوڑھے سے تمیز اور عاجزی کے ساتھ بات کی جو نوجوانوں اور شاگردوں کے لئے مناسب لہجہ ہے۔ مگر بوڑھا یہ سن کر بپھر گیا کہ یہ دونوں نوجوان انہیں چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ اس نے بلند آواز میں دونوں کو بہت ڈانٹا۔ گووند تو گھبرا گیا۔ مگر سدھارتھ اپنے ہونٹ گووند کے کان تک لے گیا اور کہا:

''میں اس بڈھے کو دکھا دوں گا کہ میں نے اس سے کیا سیکھا ہے۔''

منہمک دماغ کے ساتھ وہ سادھو کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے بوڑھے کی آنکھوں میں جھانکا اور اسے اپنی نظر سے قابو میں کر لیا، اسے تنویم کے انداز سے لیا، اسے گنگ کر دیا، اس کے ارادے کو تسخیر کر لیا اور اسے خاموش کر دیا کہ اس کی مرضی کے مطابق کام کرے۔ بوڑھا چپ ہو گیا، اس کی آنکھیں اور اس کا ارادہ مسخر ہو گیا۔ اس کے ہاتھ جھولتے رہے اور وہ سدھارتھ کی نظر کے سامنے بے بس ہو گیا۔ سدھارتھ کے خیالات نے بوڑھے سادھو کے خیالات کو تسخیر کر لیا اور اسے وہی کرنا پڑا جو سدھارتھ نے حکم دیا۔ چنانچہ بوڑھا کئی بار جھکا، ہمیں آشیرباد دی اور ہکلا کر ان کے سفر کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ دونوں نوجوانوں نے نیک خواہشات کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا، جواباً جھکے اور رخصت ہو لئے۔

راستے میں گووند نے کہا:'' سدھارتھ مجھے خبر نہیں تھی کہ تم نے سادھوؤں سے اتنا کچھ سیکھ لیا ہے۔ اتنے پرانے سادھو کو قابو میں لانا بہت مشکل ہے۔ بے حد مشکل ہے۔

گوتم

ساوتھی کے شہر میں بچہ بچہ مہاتما بدھ کے نام سے واقف تھا اور ہر گھرانہ اس بات پر رضامند تھا کہ گوتم کے خاموشی سے بھیک مانگنے والے چیلوں کی جھولیاں بھر دے۔ شہر کے قریب گوتم کا من پسند بسیرا جیتھاون کے کنج میں تھا، جو ایک بہت امیر تاجر انا تھ پندیکا نے گوتم کا چیلا بن کر اسے اور اس کے چیلوں کو تحفے میں دے دیا تھا۔

گوتم کے مسکن کو تلاش کرتے ہوئے دونوں نوجوان سادھو اپنے سوالوں کے جواب میں اور لوگوں میں مشہور ہو جانے والی کہانیوں میں بار بار اس علاقے کا نام سنتے آئے تھے، اور جب وہ ساوتھی پہنچے تو پہلی ہی مکان کے

دروازے پر، جہاں جا کر وہ چپ چاپ کھڑے ہو گئے تھے، انہیں کھانا مل گیا۔ انہوں نے کھانا کھایا اور سدھارتھ نے کھانا کھلانے والی عورت سے پوچھا:

''نیک دل بی بی ہمیں یہ بتا دے کہ تتھاگت بدھ کہاں رہتا ہے کہ ہم سادھو ہیں اور جنگل سے آئے ہیں اس واسطے کہ اس مردِ کامل کو دیکھیں اس کی سکشا اس کی زبانی سنیں۔''

عورت بولی: ''اے جنگل کے سادھوؤ، تم صحیح جگہ آ گئے ہو۔ وہ تتھاگت اناتھ پنڈیکا کے باغ جٹھان میں بسر کرتا ہے۔ رات تم وہاں گزارلو، یاتریو۔ وہاں ان تمام لوگوں کے لئے بہت جگہ ہے جو اس کی باتیں سننے جوق در جوق چلے آتے ہیں۔''

پھر گووند خوش ہوا اور خوش ہو کر کہنے لگا: ''واہ، پھر تو ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے اور ہمارا سفر تمام ہوا۔ لیکن یاتریوں کی ماں یہ تو بتاؤ تم بدھ کو جانتی ہو، اور کیا تم نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟''

عورت نے کہا: ''میں نے تتھاگت کو کئی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کسی کسی دن میں نے اسے دیکھا کہ وہ سڑکوں پر خاموشی سے چلتا چلا جاتا ہے، جوگیا لباس پہنے ہوئے اور خاموشی کے ساتھ اپنا پیالہ گھروں کے دروازوں پر بڑھا دیتا اور پیالہ بھر جاتا تو وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔''

گووند مسحور ہو کر سنتا رہا، وہ مزید سوال پوچھنا اور بہت کچھ سننا چاہتا تھا مگر سدھارتھ نے اسے یاد دلایا کہ اب چلنے کا وقت ہو گیا ہے۔ انہوں نے عورت کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے سدھارے۔ ان کو راستہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ بہت سے یاتری اور گوتم کے چیلوں میں سے راہب جٹھاون کی سمت جا رہے تھے۔ رات گئے جب وہ وہاں پہنچے تو نئے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ان کی بھیڑ نے ہلچل مچا رکھی تھی اور وہ شب بسری کیلئے پکار رہے تھے اور اپنا مقصد حاصل کر رہے تھے۔ یہ دونوں سادھو تو جنگل کی زندگی کے عادی تھے۔ جلدی سے اور خاموشی سے اپنے لئے ٹھکانہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے اور صبح تک وہیں رہے۔

جب دن نکلا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ معتقدین اور تجسس کے مارے ہوئے لوگوں کا ایک ہجوم تھا جس نے وہاں رات گذاری تھی۔ زرد لباس پہنے بھکشو کنج کی روشوں پر ادھر ادھر ٹہل رہے تھے، کہیں کہیں پیڑوں تلے بیٹھے گیان میں گم تھے یا گرما گرم بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ سایہ دار باغ اس وقت پورا ایک شہر معلوم ہو رہا تھا جو شہد کی بھنبھناتی مکھیوں سے بھرا ہوا ہو۔ زیادہ تر بھکشو اپنے اپنے پیالے سنبھالنے دوپہر کا کھانا مانگنے نکل کھڑے ہوئے کہ وہ دن میں ایک ہی وقت کھاتے تھے۔ صبح کے وقت بدھ بھی بھیک مانگنے چلے۔

سدھارتھ نے اسے دیکھا اور فوراً ہی پہچان لیا، جیسے کسی دیوتا نے اشارہ کر دیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ بھیک کا پیالہ اٹھائے، جوگیا لباس پہنے، سیدھا سادا سا آدمی خاموشی کے ساتھ وہاں سے جا رہا ہے۔

سدھارتھ نے گووند کو اشارہ کیا: ''دیکھو وہ رہا بدھ۔''

گووند نے جوگیا لباس پہنے ہوئے اس بھکشو کو غور سے دیکھا۔ اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی جو اسے دوسرے بھکشوؤں سے ممتاز کر سکے مگر گووند نے بھی فوراً اسے پہچان لیا۔ ہاں، یہ وہی تھا، اور وہ دونوں اس کے پیچھے ہو لئے اور اسے دیکھتے رہے۔

بدھ چپ چاپ، سوچ میں گم، اپنے راستے پر چلا جاتا تھا۔ اس کے شانت چہرے پر نہ دکھ تھا نہ سکھ۔ یوں لگتا تھا کہ وہ من ہی دھیرے دھیرے مسکرا رہا ہے۔ چونچال بچے کی سی مسکراہٹ چھپائے ہوئے وہ خاموشی اور سکون کے ساتھ چلتا جاتا تھا۔ اس نے لباس بالکل دوسرے بھکشوؤں جیسا پہنا ہوا تھا، مگر اس کا چہرہ اور اس کی چال، اس کی پر سکون نیچی نگاہیں، اس کے مطمئن اور قناعت رشیدہ ہاتھ جو طلب میں اٹھتے نہ تھے، اور ہاتھ کی ایک ایک انگلی سکون کی بات کہتی، تکمیل کا ذکر کرتی، کسی چیز کی تمنا نہ کرتی، کسی چیز کی نقل نہ کرتی اور اس میں سے مستقل ایک خاموشی پھوٹتی رہتی، کبھی نہ مدھم پڑھنے والی روشنی، کبھی نہ مٹنے والی شانتی۔

اور یوں گوتم شہر میں بھیک مانگنے کے لئے داخل ہوا اور دونوں سادھوؤں نے اسے اس کے رنگ ڈھنگ، چال ڈھال کی شانتی سے پہنچانا، اس کے پیکر کے سکوت کے واسطے سے جانا کہ جس میں کوئی تلاش نہ تھی، کوئی جستجو نہ تھی، کوئی ارادہ، کوئی چھل کپٹ، کوئی کوشش نہ تھی ..... بس روشنی تھی اور شانتی۔

''آج ہم اس کی سکشا اس کی زبانیں سنیں گے۔'' گووند نے کہا۔

سدھارتھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس کی سکشا کے بارے میں زیادہ بے چین نہیں تھا۔ اس کا خیال نہیں تھا کہ وہ ان سے کوئی نئی چیز سیکھ سکے گا۔ اس نے اور گووند نے بدھ کی تعلیمات کا نچوڑ تو پہلے ہی سن رکھا تھا جو ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک ہوتا ہوا ان تک بھی پہنچ چکا تھا۔ مگر اس نے بہت غور سے گوتم کی طرف دیکھا، اس کے سر کو دیکھا، اس کے شانوں پر نگاہ ڈالی، اس کے پیر دیکھے، اس کا نہ اٹھنے والا ہاتھ جو ساکت تھا، اور اسے یوں لگا کہ اس کی پور پور میں علم بھرا ہوا ہے، وہ ایسی سچائی ہے جو کلام کرتی ہے، سچائی جو سانس لیتی ہے اور

سچائی ہے جو پور پور سے پھوٹی پڑتی ہے۔ یہ شخص، یہ بدھ سر سے لے کر پیر تک پاک تھا اور مقدس تھا۔ سدھارتھ نے آج تک کسی کو اتنی عزت کی نگاہ سے نہ دیکھا تھا، کسی سے اس قدر محبت نہ کی تھی۔

وہ دونوں بدھ کے پیچھے شہر میں داخل ہوئے اور چپ چاپ واپس چلے آئے۔ ان کا اپنا ارادہ تھا کہ آج غذا سے پرہیز کریں گے۔ انہوں نے دیکھا کہ گوتم واپس آیا۔ اور اپنے چیلوں کے حلقے میں بیٹھ کر کھانے لگا.....اس نے اتنا کم کھایا کہ اس سے چڑیا کا پیٹ بھی نہیں بھر سکتا تھا۔ اور کھانے کے بعد سب سے الگ تھلگ ہو کر آم کے پیڑ تلے بیٹھ گیا۔

شام ڈھلے جب گرمی کم ہونے لگی اور وہاں موجود سارے لوگ ہوشیار ہوئے اور اکٹھے ہو گئے تو انہوں نے بدھ کو وعظ کہتے سنا۔ انہوں نے اس کی آواز سنی جو اتنی ہی پرسکون، شانت اور ٹھنڈی تھی۔ گوتم نے دکھ کی بات کی، بتایا کہ دکھ کہاں سے آتا ہے اور دکھ سے نجات کا راستہ کیا ہے۔ اس نے کہا جیون دکھ ہے، دنیا دکھ سے بھری ہوئی ہے مگر دکھ سے نجات کا راستہ ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ جو اس راستے پر بدھ کے ساتھ چلنا چاہیں ان کے واسطے مکتی ہے۔

تتھاگت دھیمی اور مستحکم آواز میں بول رہا تھا، اس نے چار بنیادی نکات کی تعلیم دی، اور ہشت پہلو راستے کا ذکر کیا۔ بہت صبر کے ساتھ وہ تعلیم دینے کے عام طریقے پر کاربند رہا، مثالیں دیتا جاتا اور بات دہراتا جاتا۔ اس کی دھیمی اور صاف آواز سننے والوں کے دلوں میں اترتی جاتی۔ جیسے روشنی، جیسے آکاش میں چمکتا ستارہ۔

جب وہ اپنی بات کہہ چکا۔ اور تب تک رات ہو چکی تھی۔ تو کوئی یاتری آگے بڑھے اور اس سے درخواست کی کہ انہیں اپنے حلقے میں شامل کر لے، اور بدھ نے انہیں قبول کر لیا اور کہا: ''تم نے سکشا کو خوب سنا۔ ہمارے سنگ ہو لو شانتی کے راستے پر چلو، دکھ کا خاتمہ کر دو۔''

شرمیلا گووند بھی آگے بڑھا اور بولا: ''میں بھی تتھاگت کی اور اس کی سکشا کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے درخواست کی کہ اسے ان کی برادری میں شامل کر لیا جائے، اور اسے قبول کر لیا گیا۔

جب بدھ رات بھر کے لئے چلا گیا تو گووند سدھارتھ کی جانب مڑا اور پرجوش لہجے میں بولا: ''سدھارتھ میرا مقصد تمہیں ملامت کرنا نہیں ہے۔ ہم دونوں نے تتھاگت کی باتیں سنیں، اس کی سکشا سنی۔ گووند نے تو سن کر انہیں تسلیم کر لیا مگر اے میرے دوست کیا تم نجات کے اس راستے پر نہ چلو گے؟ تم پھر دیر لگاؤ گے، تم اور انتظار کرو گے؟''

گووند کے الفاظ سن کر سدھارتھ نے جھرجھری لی جیسے نیند سے جاگا ہو۔ بہت دیر تک وہی گووند کے چہرے کو تکتا رہا۔ پھر وہ دھیرے سے بولا اور اس کی آواز میں کوئی تضحیک نہ تھی: ''گووند میرے دوست، تم نے قدم اٹھایا ہے، تم نے اپنا راستہ چن لیا ہے۔ تم ہمیشہ میرے دوست رہے ہو گووند، تم ہمیشہ ایک قدم میرے پیچھے چلے ہو، اکثر میں نے سوچا ہے کہ کیا کبھی گووند میرے بغیر بھی کوئی قدم اٹھائے گا، اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے؟ تم مرد ہو اور تم نے اپنا راستہ چن لیا ہے۔ دوست اس پر چلتے ہوئے اس کے آخر تک پہنچو! تمہیں مکتی مل جائے!''

گووند ابھی تک اس کی بات کو پوری طرح نہ سمجھا تھا، اور اس نے بے صبری سے اپنا سوال دہرایا: کہہ دو، میرے دوست، کہہ دو تا کہ تم بھی بدھ کی اطاعت کی سوگند کے علاوہ کچھ اور نہیں کر سکتے۔''

سدھارتھ نے گووند کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا: ''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں گووند۔ میں اپنی بات دہراتا ہوں کہ تمہیں اس راستے کے اختتام تک پہنچنا نصیب ہو، تمہیں مکتی ملے!''

اس لمحے گووند کو احساس ہوا کہ اس کا دوست اس سے بچھڑ رہا ہے اور وہ رونے لگا۔

''سدھارتھ۔'' اس نے کہا۔

سدھارتھ نے اس کو تسلی دی: ''یہ نہ بھولو گووند کہ تم اب گوتم بدھ کے چیلوں میں شامل ہو۔ تم اپنا گھر بار اور ماں باپ سب چھوڑ چکے ہو، تم اپنی ابتداء و اصل، اپنا مال و متاع سب چھوڑ چکے ہو، تم اپنی مرضی اور اپنا ارادہ اور دوستی سب کچھ چھوڑ آئے ہو۔ اس لئے کہ یہ سکشا یہی کہتی ہے، اور تتھاگت کی یہی مرضی ہے۔ اور اسی کی تم نے خواہش کی تھی۔ کل میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا گووند۔''

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر4

بہت دیر تک وہ دونوں دوست جنگلوں میں گھومتے رہے۔ پھر بہت دیر تک وہ لیٹے رہے مگر نیند کوسوں دور تھی۔ گووند بار بار اپنے دوست پر زور ڈالتا کہ بتائے تو سہی کہ آخر وہ گوتم کی تعلیمات پر کیوں نہیں چل سکتا، اسے اس میں کیا عیب نظر آتا ہے، مگر ہر بار سدھارتھ اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔ ''چین سے رہو، گووند۔ تتھاگت کی سکشا بہت اچھی ہے۔ میں بھلا اس میں کیا نقص ڈھونڈ سکتا ہوں؟''

صبح سویرے بدھ کے چیلوں میں سے ایک بھکشو، جو اس کے بہت پرانے بھکشوؤں میں سے تھا، پکارتا پھر رہا تھا کہ جن نئے لوگوں نے اطاعت کی قسم کھائی ہے وہ جوگیا لباس پہن لیں اور اس سلسلے کی ابتدائی باتیں اور اس کے فرائض سیکھ لیں۔ یہ سن کر گووند اٹھا اور اپنے بچپن کے دوست سے گلے ملا اور جا کر جوگیا لباس پہن لیا۔

سدھارتھ سوچ میں ڈوبا سارے باغ میں گھومتا پھرا۔

وہاں اسے گوتم ملا، وہ تتھاگت گوتم، اور جب سدھارتھ اسے آداب بجالایا تو اس کے چہرے پر اس قدر سکون اور خیر کی فراوانی تھی کہ اس نے بہت ہمت کر کے تتھاگت سے اجازت مانگی کہ اس سے دو باتیں کر لے۔ تتھاگت نے چپ چاپ سر ہلا کر اجازت دے دی۔

سدھارتھ نے کہا: ''اے تتھاگت کل مجھے آپ کی معرکتہ الاراء تعلیمات سننے کا شرف حاصل ہوا۔ میں اور میرا دوست بہت دور سے آپ کا شہرہ سن کر آئے تھے۔ میرا ساتھی آپ کے پاس رہے گا، اس نے اطاعت کی قسم کھالی ہے۔ مگر میں اپنی یاترا جاری رکھوں گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' تتھاگت نے بہت اخلاق سے کہا۔

''شاید میری باتیں گستاخانہ ہیں۔'' سدھارتھ کہنے لگا ''مگر میں نہیں چاہتا کہ تتھاگت تک اپنی پرخلوص گزارشات پہنچائے بغیر یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔

''کیا تتھاگت ذرا دیر اور میری بات سن سکیں گے؟''

بدھ نے چپ چاپ اپنا سر ہلا دیا۔

سدھارتھ نے کہا: ''اے تتھاگت آپ کی تعلیمات میں میں نے ایک بات کو بہت پسند کیا۔ ہر چیز واضح بہت واضح ہے اور مکمل ثبوت کے ساتھ ہے۔ آپ ثابت کر دیتے ہیں کہ دنیا ایک سلسلہ ہے، مکمل اور نہ ٹوٹنے والا، ازلی اور ابدی سلسلہ جس کی کڑیاں اسباب اور نتائج سے منسلک ہیں۔ اور کسی نے یہ بات اتنی وضاحت کے ساتھ پیش نہیں کی، اتنے بھرپور اور ناقابل انکار ثبوت کے ساتھ نہیں ظاہر کی۔ یقیناً ہر برہمن کا دل اس کے سینے میں تیز تر دھڑکتا ہوگا جب وہ آپ کی تعلیمات کے نقطہ نظر سے دنیا کو دیکھتا ہوگا کہ کامالا مربوط ہے، کوئی الجھاؤ نہیں، شیشے کی طرح شفاف ہے، جو نہ تو اتفاقات پر منحصر ہے اور نہ دیوتاؤں کی مرضی پر۔ چاہے یہ اچھا ہو یا برا، چاہے زندگی بذات خود دکھ ہو یا سکھ، چاہے اس میں بے یقینی ہو۔۔۔ شاید ایسا ہے کہ یہ اہم نہیں ہے۔ مگر دنیا کی وحدت، تمام واقعات کا ربط باہمی، ایک ہی بہاؤ کا سب چھوٹے بڑوں کو سمیٹ لینا، وہی اسباب وعلل، وہی ہونا اور مر جانا: یہ سب آپ کی تعلیمات میں روز روشن کی طرح عیاں ہے، اے تتھاگت۔ مگر آپ کی تعلیمات کے مطابق یہ وحدت بھی ایک جگہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ ایک چھوٹے سے شگاف سے اس دنیائے وحدت میں ایک عجیب سی چیز داخل ہو جاتی ہے، ایک نئی چیز، ایسی چیز جو پہلے وہاں نہیں تھی، جس کو نہ دکھایا جا سکتا ہے نہ ثابت کیا جا سکتا ہے: اور وہ ہے دنیا سے بلند تر ہو جانے کا آپ کا عقیدہ۔ مکتی کا عقیدہ، اس چھوٹے سے شگاف سے، اس چھوٹی سی رکاوٹ سے وہ ابدی اور عالم گیر قوانین ٹوٹ جاتے ہیں۔ اگر میں نے اعتراض کیا ہو تو مجھے معاف کر دیجئے۔''

گوتم خاموشی سے یہ سب سنتا رہا۔ پھر وہ مرد کامل اپنے مہربان، با اخلاق اور کھرے لہجے میں بولا: ''تم نے میری تعلیمات کو خوب سنا، اے برہمن زادے، اور یہ تمہاری خوبی ہے کہ تم نے ان کے بارے میں گہرا تفکر کیا۔ تم نے ایک عیب نکالا۔ اس کے بارے میں خوب سوچ لو۔ میں تمہیں پہلے سے خبردار کر دوں، تم جو کہ علم کے پیاسے ہو، کہ رائے جھاڑیوں کے بن کی طرح ہے اور الفاظ آپس کی متصادم ہیں۔ آراء کا کچھ مطلب نہیں ہوتا، وہ بدصورت بھی ہو سکتی ہیں، اور خوبصورت بھی، ہوشیار یا احمقانہ، کوئی بھی انہیں گلے لگا سکتا ہے یا انہیں ٹھکرا سکتا ہے۔ تم نے جو تعلیمات سنی ہیں وہ میری رائے نہیں ہیں نہ ان کا مقصد ان لوگوں کی سہولت کے لئے دنیا کی تشریح کرنا ہے جو علم کی پیاس رکھتے ہیں۔ اس کا مقصد بالکل مختلف ہے، اس کا مقصد دکھ سے نجات ہے۔ یہی گوتم سکھلاتا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔''

''میری بات پر ناراض نہ ہوں، اے تتھاگت۔'' نوجوان سدھارتھ نے کہا۔۔۔ ''میں نے یہ بات آپ سے اس لئے نہیں کہی کہ میں آپ سے الفاظ کے بارے میں جھگڑنا چاہتا ہوں۔ آپ درست کہتے ہیں کہ رائے کا مطلب کچھ نہیں ہوتا، لیکن میں ایک بات کہوں۔ میں نے آپ پر ایک پل کے لئے بھی شک نہیں کیا۔ ایک پل کے لئے

بھی میں نے شک نہیں کیا کہ آپ ہی بدھ ہیں اور اس عظیم تر مقام پر فائز ہو چکے ہیں جہاں تک پہنچنے کے لئے ہزاروں برہمن اور برہمن زادے کوشاں ہیں۔ آپ اس مقام تک اپنی جستجو کے ذریعے پہنچے، اپنے راستے سے، سوچ سے، گیان سے، علم سے، انکشاف سے پہنچے۔ آپ نے تعلیمات سے کچھ نہیں سیکھا، اور یہی میں سوچتا ہوں اے تتھاگت کہ کسی کو بھی تعلیم سے مکتی نہیں مل سکتی۔ اے تتھاگت، آپ کسی کو بھی الفاظ اور تعلیمات کے ذریعے نہیں بتا سکتے کہ نروان کی گھڑی آپ پر کیا بیتی۔ مہاتما بدھ کی تعلیمات بہت گہرائی رکھتی ہیں، بہت کچھ سکھاتی ہیں کہ نیکو کاری کے ساتھ کسی طرح جیا جائے، بدی سے کس طرح بچا جائے۔ مگر ایک چیز ہے جو یہ واضح اور قابل قدر تعلیم اپنے اندر نہیں رکھتی، اس میں وہ اسرار موجود نہیں جس کا تتھاگت نے بذات خود تجربہ حاصل کیا تھا۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے بس اسی نے۔ یہی میں نے سوچا اور محسوس کیا جب میں نے آپ کی تعلیمات سنیں۔ اسی لئے میں اپنے راستے پر چل پڑا ہوں۔ کسی دوسرے اور بہتر عقیدے کی تلاش میں نہیں کہ میں جانتا ہوں اس سے بہتر کچھ نہیں، بلکہ عقائد اور تمام معلمین کو ترک کر دینے کے لئے اور اپنے مقصد پر تنہا پہنچنے کے لئے.....یا مر جانے کے لئے۔ مگر میں اکثر اس دن کو یاد کیا کروں گا، اے تتھاگت، اور اس گھڑی کو جب میری آنکھوں نے اتنے مقدس آدمی کو دیکھا۔''

بدھ کی آنکھیں جھک گئیں، اس کے اتھاہ چہرے سے مکمل اطمینان قلب ظاہر ہو رہا تھا۔

''میری دعا ہے کہ تمہاری سوچ غلط نہ ثابت ہو۔'' تتھاگت نے دھیرے سے کہا۔ ''تم اپنا مقصد پا جاؤ! مگر یہ بتاؤ کہ کیا تم نے میری ساتھیوں کا اجتماع دیکھا میرے ان بھائیوں کو دیکھا جنہوں نے اس تعلیم سے اطاعت کی قسم کھائی ہے اے دور سے آنے والے سادھو کیا تم سمجھتے ہو کہ ان کے حق میں یہ بہتر ہوگا کہ وہ ان تعلیمات کو چھوڑ دیں اور دنیاوہوس کی زندگی کو لوٹ جائیں؟''

''یہ خیال تو میری ذہن میں کبھی نہیں آیا۔'' سدھارتھ پکار اٹھا۔ ''وہ اس تعلیم پر کاربند رہیں! وہ اپنے مقصد تک پہنچیں! میرا یہ منصب نہیں کہ میں کسی دوسرے کی زندگی کے بارے میں فیصلے صادر کروں۔ مجھے آپ اپنا فیصلہ کرنا ہے۔ مجھے انتخابات کرنا ہے اور ٹھکرا دینا ہے۔ ہم سادھو لوگ ذات سے آزادی ڈھونڈتے ہیں، اے تتھاگت۔ اگر میں آپ کا چیلا ہوتا تو مجھے خوف ہے کہ یہ صرف سطحی طور پر ہوتا اور میں اپنے آپ کو یہ دھوکا دیتا رہتا کہ میں شانت ہوں اور میں نے مکتی حاصل کر لی ہے جب کہ درحقیقت میری ذات زندہ رہتی، بڑھتی پھلتی رہتی کیونکہ وہ آپ کی تعلیمات میں منقلب ہوگئی ہوتی، آپ اور آپ کے بھکشوؤں کی برادری کے لئے میری محبت اور میری اطاعت میں ڈھل گئی ہوتی۔''

ایک ادھوری مسکراہٹ کے ساتھ، جس میں تسکین قلب کی چمک اور وفاشعاری شامل تھی، بدھ متواتر اس اجنبی کو تکتا رہا، پھر ایک ہلکے سے اشارے سے کہ جو بمشکل دیکھا جا سکتا تھا، اسے برطرف کر دیا۔

''تم ہوشیار رہو اے سادھو۔'' تتھاگت نے کہا۔ ''تم ہوشیاری سے باتیں کرنا جانتے ہو۔ ضرورت سے زیادہ ہوشیاری سے بچ کے رہنا۔''

بدھ چلا گیا اور اس کی نظر اور ادھوری مسکراہٹ سدھارتھ کی یادداشت میں ہمیشہ کے لئے ثبت ہوگئی۔

میں نے کسی ایسے آدمی کو اس طرح دیکھتے اور مسکراتے، اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا، وہ سوچتا رہا۔ میں بھی چاہوں گا کہ اسی طرح دیکھوں اور مسکراؤں، اٹھوں اور چلوں پھروں، اتنا آزاد، اتنا قابل قدر، اتنا پرسکون اور صاف دل، بچوں کی طرح معصوم اور اتنا پراسرار۔ کوئی آدمی اسی وقت اس طرح مسکرا سکتا ہے اور چل پھر سکتا ہے جب اس نے اپنی ذات کو مسخر کر لیا ہو۔ میں بھی اپنی ذات کو تسخیر کروں گا۔

میں نے ایک آدمی ایسا دیکھا ہے، ایک ہی آدمی، سدھارتھ نے سوچا، جس کے سامنے مجھے نگاہیں جھکانی پڑتی ہیں۔ میں کبھی کسی اور کے سامنے نگاہیں نہ جھکاؤں گا۔ کوئی دوسری تعلیم مجھے کبھی اس قدر متاثر نہ کر سکے گی کہ اس شخص کی تعلیم بھی نہ کر سکی۔

بدھ نے مجھے لوٹ لیا، سدھارتھ نے سوچا۔ اس نے مجھے لوٹ لیا، پھر بھی اس نے مجھے بہت قیمتی چیز عطا کی ہے۔ اس نے مجھ سے میرا دوست چھین لیا، جسے مجھ پر وشواس تھا اور جو اب اس پر وشواس رکھتا ہے، وہ میرا سایہ تھا اور اب گوتم کا سایہ تھا۔ مگر اس نے مجھ کو سدھارتھ بخشا، مجھے میری ذات دی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر5

نروان

جب سدھارتھ وہ کنج چھوڑ چلا جہاں تتھاگت گوتم بدھ رہتا تھا اور جہاں گووند بھی رہ گیا تھا تو اسے یوں لگا کہ جیسے وہ اپنی گزشتہ زندگی کو بھی یہیں اسی کنج میں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ جب وہ راستے پر دھیرے دھیرے چلتا جا رہا تھا تو اس کا دماغ خیالات سے پر تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، یہاں تک کہ یہ احساس اس پر حاوی ہو گیا اور وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں وہ اسباب پہنچانے لگا، کیونکہ اسے محسوس ہوا کہ اسباب کو پہنچانا ہی دراصل سوچنا ہے اور صرف سوچ کے ذریعے ہی سے احساس علم بنتا ہے اور گم ہو جانے سے بچتا ہے، حقیقی ہو جاتا ہے اور پختہ ہونے لگتا ہے۔

سدھارتھ اپنے راستے پر چلتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اب وہ نوجوان نہ تھا، مرد بن چکا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی چیز اسے پیچھے چھوڑ گئی ہے جیسے وہ پرانی کینچلی جو سانپ جھاڑ دیتا ہے۔ کوئی چیز تھی جو اب اس میں نہ رہی تھی، ایسی چیز جو اوائل عمر سے اس کے ساتھ چلی تھی، اس کا حصہ تھی: یہ خواہش تھی علماء سے ملنے کی اور ان سے تعلیم حاصل کرنے کی۔ وہ اس آخری معلم سے مل چکا تھا اور اسے بھی چھوڑ چکا تھا، جو بہترین اور سب سے زیادہ دانا اور مقدس ترین تھا، بدھ تھا سدھارتھ کو اسے بھی چھوڑنا ہی تھا، اس کی تعلیمات سدھارتھ کے لئے قابل قبول نہ تھیں۔

آہستہ آہستہ وہ اپنے راستے پر سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا اور اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا: تم ان تعلیمات سے اور ان تعلیم دینے والوں سے کیا سیکھنا چاہتے تھے؟ اور اس نے سوچا: مجھے ذات کی تلاش تھی، میں اس کی نوعیت اور فطرت کے بارے میں سیکھنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس ذات سے نجات پا لوں، اس کو مسخر کر لوں مگر میں اس پر فتح نہ پا سکا، میں تو بس اسے دھوکا دے سکا، اس سے بھاگتا رہا، اس سے چھپتا پھرا۔ واقعی دنیا کی کوئی چیز میرے خیالات پر اس طرح طاری نہیں ہو گئی جیسے یہ ذات، یہ پہیلی، کہ میں زندہ ہوں، کہ میں یکتا ہوں اور باقی تمام لوگوں سے علیحدہ اور مختلف ہوں کہ میں سدھارتھ ہوں، اور میں دنیا کی کسی چیز کے بارے میں اتنا کم نہیں جانتا جتنا اس سدھارتھ کے بارے میں، اپنے بارے میں۔

سوچنے والا اپنے راستے پر چلتے چلتے اچانک رک گیا اور اس خیال کی گرفت میں آ کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا، اور اس خیال سے فوراً ایک خیال اور ابھرا۔ اور وہ یہ تھا: جس وجہ سے میں اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ جس وجہ سے سدھارتھ میرے لئے اجنبی اور انجان رہا ہے، وہ یہ ہے، اس کی وجہ صرف ایک بات ہے۔۔۔ کہ میں اپنے آپ سے ڈرتا تھا، میں خود اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا۔ میں برہما اور آتما کو ڈھونڈ رہا تھا، میں اپنے آپ کو تہس نہس کر دینا چاہتا تھا، اپنے آپ سے الگ ہونا چاہتا تھا تاکہ اس نامعلوم باطن کو معلوم کروں جو تمام اشیاء کا مرکز ہے، جو آتما ہے، جو حیات ہے، مطلق ہے، الوہی ہے، مگر ایسا کرنے میں میں نے اپنے آپ کو راستے میں کھو دیا۔

سدھارتھ نے اپنے چاروں طرف دیکھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلنے لگی اور اس کے سارے وجود میں ایک بہت لمبی نیند سے جاگنے کی کیفیت پھیل گئی۔ فوراً ہی وہ تیز تیز چلنے لگا، اس آدمی کی طرح جسے پتا ہو کہ کیا کرنا ہے۔

ہاں، اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا، اب میں سدھارتھ سے بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں اپنے خیالات، آتما اور اس دنیا کے دکھوں کے لئے وقف نہیں کروں گا۔ میں اپنے آپ کو ملیا میٹ اور تباہ نہیں کروں گا کہ ان کھنڈروں کے سربستہ راز معلوم کروں۔ اب میں رگ وید اور اتھروید اور سنیاس اور دوسری تعلیمات حاصل نہیں کروں گا۔ اب میں اپنے آپ سے سیکھوں گا اور آپ اپنا شاگرد بنوں گا۔ میں اپنے آپ سے ہی سیکھوں گا کہ سدھارتھ میں کیا اسرار ہیں۔

اس نے چاروں طرف نظر ڈالی جیسے دنیا کو پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔ دنیا کتنی حسین تھی، اجنبی، نامعلوم اور پر اسرار۔ یہاں نیلا رنگ تھا، زرد رنگ تھا، سبز رنگ تھا، آسمان اور دریا، جنگل اور پہاڑ، سب کے سب حسین، سب پر اسرار، سحر انگیز اور ان سب کے درمیان وہ، یعنی سدھارتھ جو جاگ چکا تھا اور اپنی جانب گامزن تھا۔ یہ سب کچھ، یہ نیلا اور زرد، یہ دریا اور جنگل پہلی دفعہ سدھارتھ کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ اب یہ مایا کا جادو نہ تھا، اب یہ ظاہری دنیا کے نظاروں کا اتفاقی تنوع یا بے معنویت نہ تھی جس سے عمیق فکر والے برہمن نفرت کرتے تھے، کیونکہ وہ کثرت کو ٹھکراتے تھے اور وحدت کی جستجو کرتے تھے۔ دریا تو دریا تھا، اور اگر سدھارتھ کے اندر کا یکتا اور ابد اس نیلاہٹ اور اس دریا میں زندہ تھا تو یہ بھی ابدی اور الوہی منشاء کا کرشمہ تھا کہ نیلا ہو اور زرد ہو، اور آسمان ہوں اور جنگل ہوں۔ اور یہاں سدھارتھ ہو۔ معنی اور حقیقت کہیں بہت دور چیزوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے، بلکہ ان کے اندر تھے، ان سب کے اندر تھے۔

میں بھی کسی قدر بہرا اور احمق رہا ہوں، اس نے تیز چلتے چلتے سوچا۔ جب کوئی بھی وہ چیز پڑھتا ہے جو وہ سیکھنا چاہتا ہے تو وہ اس کے حروف اور اعراب سے نفرت نہیں کرتا اور ان کو نظر کا دھوکہ قرار نہیں دیتا، جیسے کہ وہ حادثاتی اور بے

مصرف چھلکے ہوں، بلکہ وہ ان کو حرف بہ حرف ہجے کر کے پڑھتا ہے، ان سے محبت کرتا ہے۔ مگر میں، جو کہ دنیا کی کتاب پڑھنا چاہتا ہوں اور اپنی ذات کی کتاب پڑھنا چاہتا تھا، میں ان حروف اور ان اشارات سے نفرت کرنے لگا تھا۔ میں ظاہری دنیا کو نظر کا دھوکا کہتا تھا۔ میں اپنی آنکھوں اور اپنی زبان کو محض ایک اتفاق گردانتا تھا۔ اب یہ ختم ہو گیا، میں جاگ گیا ہوں۔ میں واقعی جاگ چکا ہوں اور دراصل آج پیدا ہوا ہوں۔

لیکن جب یہ خیالات سدھارتھ کے ذہن سے گزر رہے تھے تو وہ اچانک یہاں ساکت کھڑا ہو گیا جیسے اس کے راستے میں سانپ پڑا ہو۔

پھر اچانک اس پر یہ بات بھی واضح ہوئی: وہ اس شخص کے مانند تھا جو لمبی نیند سے جاگا ہو یا نوزائیدہ ہو، اسے اپنی زندگی از سر نو شروع کرنا تھی۔ آج صبح جب وہ جیتاون میں تتھاگت کے کنج سے نکلا تھا تو وہ اپنی ہی جانب چلا تھا، یہی اس کا ارادہ تھا اور اسے یہ بالکل فطری بات معلوم ہوتی تھی کہ اتنے برس کے سنیاس کے بعد اپنے گھر اور اپنے باپ کے گھر لوٹ جائے۔ لیکن اب جب کہ وہ اس طرح ساکت کھڑا ہوا تھا جیسے اس کے راستے میں سانپ پڑا ہوا ہو۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ میں اب وہ نہیں ہوں جو کہ تھا، میں سنیاسی نہیں ہوں، میں راہب نہیں ہوں، میں برہمن نہیں ہوں۔ میں اپنے باپ کے گھر جا کر کیا کروں گا؟ پھر پڑھنے لگوں گا اور اسی طرح چڑھاوے چڑھایا کروں گا اور یوگ آسن جمایا کروں گا؟ یہ سب کچھ اب میرے لئے ختم ہو چکا ہے۔

سدھارتھ ساکت کھڑا رہا اور ایک لمحے کے لئے برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ کس قدر اکیلا ہے، وہ من ہی من میں کانپ اٹھا، جیسے وہ کوئی ننھی سی چڑیا یا خرگوش ہو۔ وہ کتنے برس سے بے گھر تھا مگر یہ خوف ناک احساس آج ہی ہوا تھا۔ پہلے تو وہ حالت کشف میں بھی اپنے باپ کا بیٹا بنا رہا تھا، اسی کی طرح اعلیٰ ذات کا برہمن اور دھارمک آدمی۔ اب وہ محض سدھارتھ تھا، سدھارتھ جو جاگ چکا تھا، اور اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس نے لمبا سانس بھرا اور جھرجھری لی۔ کوئی بھی اس قدر تنہا نہیں تھا۔ اب وہ اس بات کا پابند نہ تھا کہ کسی اعلیٰ ذات کا فرد یا کوئی ہنرمند کاریگر بنے تاکہ کسی برادری کا جزو بن سکے اور اس کی زبان اور انداز میں پناہ حاصل کرے۔ وہ برہمن نہ تھا کہ برہمنوں کی زندگی میں شریک ہو سکے، وہ سنیاسی نہ تھا کہ سادھو بن سکے۔ لیکن گھنے جنگلوں میں چھپے ہوئے جوگی بھی اتنے اکیلے نہ تھے، وہ بھی کسی طبقے کے فرد تھے۔ گووند تو بھکشو بن گیا تھا، اور سینکڑوں ہزاروں بھکشو اس کے بھائی تھے، اسی کا سا لبادہ اوڑھتے تھے، اس کے عقائد میں شریک تھے اور اس کی زبان بولتے تھے۔ مگر وہ جو کہ سدھارتھ تھا، وہ کہاں تھا؟ وہ کس کی زندگی میں شریک تھا؟ وہ کس کی زبان میں بات کر سکتا تھا؟

اور اس لمحے جب اس کے اردگرد کی دنیا پگھلنے لگی تو وہ اس طرح تنہا کھڑا تھا جیسے آسمانوں میں ستارہ، اور برف سی نراشا اس پر غلبہ پا رہی تھی، مگر اس کے باوجود وہ اسی شدت اور تیقن کے ساتھ ثابت قدم تھا۔ یہ اس کے جاگنے کی آخری جھرجھری تھی، اس کی پیدائش کا آخری درد، فوراً ہی وہ آگے بڑھ گیا اور چلنے لگا، جلدی جلدی اور بے صبری سے مگر گھر کی جانب نہیں، نہ واپس اپنے باپ کے پاس۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ رہا تھا۔

کملا

سدھارتھ راستے کے ہر قدم پر ایک نئی بات سیکھتا کہ دنیا نے اس کے واسطے ایک نیا روپ دھار لیا تھا اور وہ اس کا اسیر ہوا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ سورج جنگلوں اور پہاڑوں پر طلوع ہوتا ہے اور دور دراز ناریل کے پیڑوں والے ساحلوں پر ڈوب جاتا ہے۔ رات کو وہ دیکھتا کہ آسمان پر تارے جگمگا رہے ہیں اور بنسیا کی شکل کا چاند بجرے کی طرح ڈول رہا ہے۔ اسے درخت نظر آتے اور ستارے، جانور، بادل، دھنک، چٹان، پتھر، پودے، پھول، جھرنے اور دریا، صبح سویرے جھاڑیوں پر ڈلکتے شبنم کے قطرے، دور دراز کی نیلگوں، دھندلی پہاڑیاں: گیت گاتے پرندے، گنگناتے بھونرے اور دھان کے کھیتوں میں دھیرے دھیرے چلتی ہوا۔ یہ ساری چیزیں، ہزار رنگ روپ والی چیزیں، یہ تو ہمیشہ سے تھیں۔ سورج اور چاند کب سے جگمگا رہے تھے، دریا بہتے آئے تھے اور بھونرے اسی طرح گنگنایا کرتے تھے، مگر پہلے یہ سب سدھارتھ کی نظر میں کچھ بھی نہیں تھا، بس ایک گریزاں، پر فریب سراب تھا، جسے وہ شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، جس کی اس نے مذمت کی تھی تاکہ اس کے خیالات سے خارج اور ترک ہو جائے کیونکہ یہ سب حقیقت نہ تھی، حقیقت تو وہ تھی جو مرئی اشیاء کے دوسرے جانب تھی۔ مگر اب اس کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں؟ وہ مرئی اشیاء کو دیکھتا تھا اور جانتا تھا اور ان کی دنیا میں اپنی جگہ ڈھونڈتا تھا۔ اسے حقیقت کی تلاش نہیں تھی، اس کا مقصد کسی دوسری سمت نہ تھا۔ اور اس طرح سے دیکھا جائے تو دنیا بہت حسین ہو جاتی ہے۔ کسی جستجو سے عاری، سیدھی سادی، بچوں کی طرح معصوم۔ چاند اور ستارے خوب صورت تھے۔ جھرنے، ساحل، جنگل اور جنگلوں میں چٹانیں، چوپائے اور سنہرے ٹڈے، پھول اور تتلیاں خوب صورت تھیں۔ کتنا بھلا لگتا تھا کہ اسی طرح اس دنیا سے گزرا جائے، بچوں کی طرح، جاگے ہوؤں کی طرح، بغیر کسی وسوسے کے، اور بس لمحہ حاضر سے متعلق۔ دور کہیں سورج قہر برساتا تھا، دور کہیں جنگلوں کے سائے میں خنکی تھی،

دور کہیں کدو اور کیلے لگے ہوئے تھے۔ راتیں اور دن مختصر تھے، ہر لمحہ اس سرعت سے گزر جاتا جیسے سمندروں پر کشتیوں کے بادبان اور خزانوں سے لدی کشتی کے بادبان تلے مسرتوں کی کھنک۔ سدھارتھ نے دیکھا کہ جنگل کے گھن میں بندروں کی ٹولی اونچی نیچی شاخوں پر اچھلتی پھاندتی وحشی، پرشوق آوازیں نکالتی تھی۔ سدھارتھ نے دیکھا کہ ایک دنبہ بھیڑ کے پیچھے دوڑا اور اس سے جفت ہونے لگا۔ نرکلوں سے بھری جھیل میں اس نے جھانکا کہ مچھلیاں شام کی بھوک میں غذا کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ ننھی ننھی مچھلیوں کے اچھلتے ڈوبتے، چمکدار غول ان بڑی مچھلیوں سے دور بھاگتے تھے۔ تعاقب کرنے والوں کی بھری ہوئی تیز تیز حرکت کے سبب پانی میں بننے والی لہروں میں شکتی اور لوبھ کا عکس پڑ رہا تھا۔

یہ سب کچھ ہمیشہ سے تھا اور اس نے کچھ نہ دیکھا تھا۔ وہ کبھی حاضر ہی نہیں رہا تھا۔ اب وہ موجود اور اس کا ہو چکا تھا۔ اپنی آنکھوں میں اسے روشنی اور سائے کھیلتے نظر آتے، اپنے من میں اسے چاند اور ستاروں کی موجودگی کا احساس ہوتا۔

راستے میں سدھارتھ کو وہ سب کچھ یاد آیا جو جٹھاون کے کنج میں اس پر بیتا تھا، وہ سکشا جو اس نے مقدس بدھ کی زبانی سنی تھی۔ گووند سے کس طرح جدائی ہوئی تھی اور تتھاگت سے کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اسے وہ ایک ایک لفظ یاد تھا جو اس نے تتھاگت سے کہا تھا، اور اسے حیرت تھی کہ اس نے کس طرح ایسی باتیں کہہ ڈالیں جن کے بارے میں اسے ٹھیک سے پتہ نہ تھا۔ بدھ سے اس نے جو کچھ کہا تھا۔ کہ بدھ کی دانش اور اسرار پڑھائے نہیں جا سکتے، کہ وہ برتر از اظہار و ابلاغ تھے۔ اور جو کچھ اس پر نروان کے سمے بیت گیا، یہی تو وہ سب کچھ تھا جس کا تجربہ وہ خود حاصل کرنا چاہتا تھا، جس کا تجربہ اسے ہونے لگا تھا۔ اسے خود تجربہ حاصل کرنا تھا۔ اسے مدت سے معلوم تھا کہ اس کی ذات ہی آتما ہے کہ اسی ابدی فطرت سے بنی ہے جو برہما کی ہے۔ مگر یہ ذات اسے مل ہی کہاں سکی تھی، کیونکہ وہ اسے اپنے خیالات کے جال میں پکڑنا چاہتا تھا۔ اس کا جسم تو یہ ''ذات'' نہیں تھا اور نہ اس کے حواس خمسہ، نہ اس کی فکر نہ ادراک و فہم، نہ اس کا حاصل کردہ علم، نہ اس کی منطقی مہارت جس کے ذریعے سے وہ نتائج اخذ کرتا تھا اور جس کے ذریعے سے موجودہ خیالات میں سے نئے خیالات حاصل کرتا تھا، ان میں سے کوئی چیز بھی اس کی ذات نہیں تھی۔ نہیں، خیالات کی یہ دنیا تو ابھی اسی جانب تھی اور جب آپ ذات کے واقعاتی احساس کو غارت کر کے اس کو خیالات اور فکر و علم سے بھر دیں، تو اس کا راستہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ خیال اور احساس دونوں بہت اچھی چیزیں ہیں، انہی دونوں کے پیچھے وہ آخری معانی چھپے ہوئے ہیں، ان دونوں کی بات سننا، ان سے کھیلنا بے کار کام نہیں ہے، ان میں سے کسی ایک کو نہ تو سر چڑھانا چاہیے نہ نظر انداز کرنا چاہیے بلکہ ان دونوں کی آوازوں کو یکسوئی اور توجہ سے سننا چاہیے۔ وہ اسی چیز کی جستجو کرے گا جس کا حکم اس کے اندر کی آواز دے گی، کہیں نہیں رکے گا سوائے اس کے جہاں کا مشورہ یہ آواز دے گی۔ اپنے نروان کے سمے گوتم بڑ کے پیڑ تلے کیوں بیٹھ گیا تھا؟ اس نے ایک آواز سنی تھی، اس کے من میں ایک آواز ابھری تھی جس نے اسے حکم دیا تھا کہ اس پیڑ تلے ٹک جاؤ، اور پھر اس نے جسم کی کمزوریاں، بھینٹ چڑھاوے، اشنان اور پرارتھنائیں، کھانا پینا، سونا اور خواب دیکھنا ان سب کا سہارا نہیں ڈھونڈا تھا؟ اس نے بس من کی آواز سنی تھی۔ اسکے سوا کسی خارجی حکم کو نہ ماننا، صرف اسی آواز کو سننا، اس کے واسطے تیار رہنا..... یہی ٹھیک تھا۔ اس کے علاوہ کوئی چیز لازم نہیں تھی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

سدھارتھ
ہرمن ہیسے
مترجم: آصف فرخی

قسط نمبر6

رات جب وہ ایک مانجھی کی کٹیا میں سو رہا تھا تو سدھارتھ نے سپنا دیکھا۔اس نے یہ سپنا دیکھا کہ گووند سادھوؤں کا جوگیا لباس پہنے اس کے سامنے کھڑا ہے۔گووند اداس لگ رہا تھا اور اس سے پوچھ رہا تھا کہ ''تم مجھے کیوں چھوڑ گئے؟'' یہ سن کر اس نے گووند کو لپٹا لیا، اپنے بازو اس کے گرد حمائل کر دیئے اور جب وہ اسے سینے سے لگا کر پیار کر رہا تھا تو گووند نہ تھا ایک عورت تھی جس کے لبادے میں سے بھری بھری چھاتیاں چھلکی پڑ رہی تھیں اور سدھارتھ وہاں لیٹ رہا اور اس کا دودھ پینے لگا! بہت خوش ذائقہ تھا اس چھاتی کا دودھ۔اس میں عورت کا اور مرد کا ذائقہ اور سورج اور جنگل کا ذائقہ، جانوروں اور پھولوں کا ذائقہ، ہر پھل کا مزہ تھا اور ہر لذت کی اپنی کیفیت تھی۔اس میں نشہ تھا۔جب سدھارتھ جاگا تو پھونس کی کٹیا کے سامنے دریا جھلملا رہا تھا اور جنگل میں کسی شب گزار پرندے کی پکار واضح اور صاف سنائی دے رہی تھی۔

جب دن چڑھا تو سدھارتھ نے مانجھی سے کہا کہ اسے دریا پار اتار دے۔مانجھی اسے بانس کی ناؤ میں لے چلا۔صبح کی روشنی میں دریا کی تنی چادر گلابی ہو رہی تھی۔

''بہت سندر دریا ہے'' اس نے اپنے میزبان سے کہا۔

''ہاں'' مانجھی بولا'' یہ بہت سندر دریا ہے۔مجھے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اس سے پیار ہے۔میں نے اس کی آوازیں سنی ہیں، اس کو دیکھا ہے، اور ہمیشہ اس سے کوئی نئی بات سیکھی ہے۔آدمی دریا سے بہت سیکھ سکتا ہے۔''

''تمہارا شکریہ، بھلے آدمی۔'' سدھارتھ پار اتر کے بولا۔''افسوس کہ میرے پاس تمہیں دینے کے لئے کوئی تحفہ ہے نہ نقدی۔میں برہمن ہوں، سادھو ہوں اور بے گھر ہوں''

''مجھے پتہ ہے۔مجھے تم سے کسی اجرت کی توقع نہیں ہے۔تم کسی اور وقت حساب چکا دو گے۔''

''تمہیں اس کی بھی امید ہے؟'' سدھارتھ نے پُر مذاق لہجے میں پوچھا۔

''بالکل یہ بھی میں نے دریا سے سیکھا ہے۔ہر چیز لوٹ کے آتی ہے۔اور تم بھی واپس آؤ گے۔اچھا اب رخصت، تمہاری دوستی ہی میرا معاوضہ ہے! جب دیوتاؤں کو چڑھاوا چڑھانا تو مجھے یاد کر لینا!''

وہ دونوں مسکراتے ہوئے اپنے راستوں پر ہو لئے۔سدھارتھ کو مانجھی کی دوستی اچھی لگی۔اس نے سوچا یہ بھی گووند کی طرح ہنستا رہتا ہے۔جو بھی مجھے راستے میں ملتا ہے گووند جیسا ہوتا ہے۔یہ سب شکر گزار ہوتے ہیں حالاں کہ میں خود ان کا احسان مند ہوں۔سب اطاعت گزار ہوتے ہیں، میرے دوست بننا چاہتے ہیں، تابع ہونا اور کم سوچنا چاہتے ہیں لوگ بالکل بچے ہوتے ہیں۔

دوپہر کے قریب وہ ایک گاؤں سے گزرا۔مٹی سے پتی جھونپڑیوں کے آگے گلی میں بچے پھدک رہے تھے، کدو کے بیجوں اور اور گھونگھوں سے کھیل رہے تھے۔وہ شور مچانے اور آپس میں کشتی لڑ رہے تھے مگر اس اجنبی سادھو کو دیکھ کر بھاگ جاتے۔گاؤں کے سرے پر راستہ ایک چھوٹی ندی کے ساتھ ساتھ جاتا تھا، اور ندی پر ایک لڑکی جھکی کپڑے دھو رہی تھی۔سدھارتھ نے اسے پرنام کیا تو اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر اس کی اوڑ دیکھا تو سدھارتھ کو اس کی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔اس نے مسافروں کے دستور کے مطابق دعائے خیر پکار کر کہی اور پوچھا کہ بڑے شہر تک کتنا راستہ باقی ہے۔یہ سن کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے پاس آ گئی۔اس کے من موہنے مکھڑے پر نم ہونٹ چمک رہے تھے۔وہ سدھارتھ سے پوچھنے لگی کہ تم نے کھانا کھایا ہے، اور کیا یہ سچ ہے کہ سادھو راتوں کو جنگل میں اکیلے سوتے ہیں اور انہیں کوئی عورت ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔پھر اس نے اپنا داہنا پیر سدھارتھ کے سیدھے پیر پر رکھ دیا اور وہ اشارہ کیا جو ناری اس وقت کرتی ہے جب وہ کسی نر کو محبت کے اس کام کا بلاوا دیتی ہے جسے مقدس شاستروں میں ''پیڑ پر چڑھنا'' لکھا ہے۔سدھارتھ کا خون سنسنانے لگا، اور اس لمحے اپنے سپنے کو پہچان کر وہ اس عورت کی جانب ملتفت ہو کر ذرا سا جھکا اور اس کے سانولے جوبن کے ابھار کو چوم لیا۔نگاہ اٹھا کر اس نے دیکھا کہ اس ناری کا ہنستا چہرہ وفور خواہش سے گلنار ہو رہا ہے۔اس کی ادھ کھلی آنکھیں تمنا کا اظہار کر رہی ہیں۔

سدھارتھ کے دل میں وہی تمنا کروٹیں لینے لگی اور جسم کی خواہش نے سر ابھارا مگر چونکہ اس نے ابھی تک کسی عورت کو چھوا نہیں تھا تو وہ ایک پل کے لئے جھجک گیا حالاں کہ اس کے ہاتھ اس عورت کو تھامنے کے لئے بے قرار ہو رہے تھے۔اس لمحے اس نے اپنے اندر کی آواز سنی اور آواز نے کہا: ''نہیں!'' بس پھر اس ناری کے مسکراتے چہرے کا سارا جادو ہوا ہو گیا، اسے ایک نوجوان عورت کی ہوس ناک نظروں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ہولے سے اس نے عورت کا گال چھوا اور اس کو نامراد چھوڑ کر جلدی سے بانسوں کے بن میں غائب ہو گیا۔

شام سے پہلے وہ شہر پہنچ گیا اور دل میں خوش ہوا کہ وہ لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا تھا۔وہ اتنے دنوں تک جنگل میں رہا تھا کہ پچھلی رات جو اس نے مانجھی کی کٹیا میں گزاری تھی بہت عرصے کے بعد وہ پہلی رات تھی جو اس نے

چھت کے نیچے بسر کی تھی۔
شہر کے باہر ایک خوبصورت باغ کے نزدیک مسافر کو ملازم عورتوں اور مردوں کا تانلہ ملا جو ٹوکریاں اٹھائے ہوئے جا رہا تھا۔ ان کے بیچوں بیچ چار کہار ایک سجی سجائی پالکی اٹھائے ہوئے تھے جس پر تنی سرخ چھت گیری کے نیچے ان کی مالکن بیٹھی تھی۔ سدھارتھ باغ کے پھاٹک کے پاس رک گیا اور نوکروں، لونڈیوں اور ٹکوریوں کے قافلے کو دیکھنے لگا۔ بالوں کے ڈھیر کے نیچے چمکتا ہوا سندر چہرہ مکھڑا تھا، سرخ ہونٹ جیسے تازہ انجیر محراب دار ابرو، نین چنچل اور بے حد تیز، اور صراحی دار گردن جو سبز اور سنہری لبادے میں گم میں ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ مضبوط اور ملائم نظر آ رہے تھے، لمبے لمبے پتلے پتلے، اور کلائی میں سونے کی موٹی موٹی چوڑیاں۔
سدھارتھ نے دیکھا کہ وہ کتنی سندھر ہے اور اس کا دل جھوم اٹھا۔ پالکی اس کے پاس سے گزری تو وہ تسلیم کے واسطے جھک گیا اور جب اٹھا تو اس روشن چہرے کو پھر دیکھا ایک لمحے کو ان چنچل کی آنکھوں میں جھانکا اور اس کی سانسوں میں ایسی مہک آئی جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ سونگھی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ سندر ناری مسکرائی اور اپنا سر ہلایا، پھر اپنے ملازموں سمیت باغ میں داخل ہو گئی۔
سدھارتھ نے دل میں سوچا کہ میں شہر میں شبھ لگن میں قدم رکھ رہا ہوں۔ اس کا جی چاہا کہ فوراً باغ کے اندر چلا جائے، مگر اس نے غور کیا تو خیال آیا کہ جب وہ پھاٹک کے پاس کھڑا تھا تو اس ناری کے ملازموں نے اسے کس قدر حقارت اور شک سے دیکھا تھا جیسے نظروں ہی نظروں میں اسے جھڑک رہے ہوں۔
اس نے سوچا کہ میں ابھی تک سادھو ہوں اور اس ناتے تپسوی اور بھکاری ہوں۔ اب میں اس طرح نہیں رہ سکتا، میں اس طرح باغ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ پھر وہ ہنس پڑا۔
باغ کے آس پاس گھومتے ہوئے اسے جو پہلا شخص ملا اس سے اس عورت کا نام پوچھا اور معلوم ہوا کہ یہ باغ کملا کی ملکیت ہے جو شہر کی مشہور گنکھنی ہے اور باغ کے علاوہ چوک میں بھی اس کا مکان ہے۔
پھر وہ شہر میں داخل ہوا۔ اب اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ اسی غرض سے وہ شہر کا جائزہ لینے لگا بھول بھلیاں سی گلیوں میں پھرا، کہیں کہیں رک کر دیکھنے لگا اور کبھی دریا کے گھاٹ پر بنی پتھریلی سیڑھیوں پر ٹک گیا۔ شام پڑے اس نے دیکھا کہ ایک نائی سائے دار محراب کے نیچے کام کر رہا ہے۔ پھر اس کو دیکھا کہ وشنو کے مندر میں بیٹھا ہے۔ سدھارتھ نے اس سے دوستی گانٹھ لی اور اسے وشنو اور لکشمی کے خوب قصے سنائے۔ رات ہوئی تو وہ دریا کنارے پڑی کشتیوں میں سو رہا اور تڑکے اٹھ کے دکان میں گاہکوں کے آنے سے پہلے نائی کے پاس جا پہنچا اور داڑھی صاف کروا ڈالی۔ اس نے اپنے بالوں میں مانگ جمائی اور تیل لگایا۔ پھر دریا میں نہانے چلا گیا۔
سہ پہر کے وقت جب خوب رو کملا پالکی میں بیٹھی اپنے باغ میں آ رہی تھی تو سدھارتھ دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ تسلیمات بجالانے کے لئے جھکا تو کملا نے اسے پرنام کیا۔ نوکروں کے قافلے میں جو نوکر سب سے پیچھے چل رہا تھا سدھارتھ نے اسے اشارے سے بلایا اور کہا کہ اپنی مالکن سے کہو کہ ایک نوجوان برہمن آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نوکر واپس آیا اور سدھارتھ سے کہا میرے ساتھ آیئے اور اسے شہ نشین پر لے گیا جہاں کملا چھپر کھٹ پر نیم دراز تھی۔ کملا کے اشارے پر نوکر باہر چلا گیا۔
''کل تم تو نہیں باہر کھڑے تھے اور مجھے جھک کر پرنام کیا تھا؟'' کملا نے پوچھا ''جی ہاں میں نے کل تمہیں دیکھا تھا اور پرنام کیا تھا۔''
''مگر کل تو تمہارے داڑھی تھی اور بال تمام مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔''
''تم نے خوب دیکھا اور سب کچھ دیکھ لیا۔ تم نے برہمن زادے سدھارتھ کو دیکھا جو اپنا گھر بار اس لئے چھوڑ آیا کہ سادھو بن جائے اور تین برس تک سادھو بنا رہا۔ مگر اب میں اس راستے سے ہٹ گیا ہوں اور اس شہر آیا تو سب سے پہلے جس پر نگاہ پڑی وہ تم تھیں۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کملا کہ تم وہ پہلی عورت ہو جس سے سدھارتھ نے نگاہیں جھکائے بغیر بات کی ہے۔ اور میں کبھی کسی سندر ناری کو دیکھ کر نگاہیں نہ جھکاؤں گا۔''
کملا مسکرانے لگی اور مورچھل سے کھیلتے ہوئے بولی: ''بس یہی بتانے آئے ہو؟''
''میں تمہیں یہ بتانے آیا ہے ہوں اور تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ تم سندر ہو۔ اور اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میں چاہوں گا کہ تمہاری دوست اور میری گرو بن جاؤ کہ میں اس فن سے نابلد ہوں جس کی تم ماہر ہو۔''
یہ سن کر کملا ہنس پڑی ''میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جنگل سے کوئی سادھو میرے پاس آئے اور مجھ سے کچھ سیکھنے کی خواہش ظاہر کرے۔ میرے پاس کبھی کوئی لمبے بالوں اور پھٹے کپڑوں والا سادھو نہیں آیا۔ میرے پاس بہت نوجوان آتے ہیں، ان میں برہمن زادے بھی ہوتے ہیں۔ مگر وہ میرے پاس خوب عمدہ کپڑے اور جوتے پہن کر آتے ہیں ان کے بالوں میں خوشبوں بسی ہوتی ہے اور بٹوؤں میں سکے کھنکھناتے ہیں اس طرح آتے ہیں لوگ میرے پاس، سمجھے اے جنگل کے سادھو!''

سدھارتھ نے کہا: ''میں نے تم سے سیکھنا شروع کر دیا ہے۔ کل ہی میں نے تم سے ایک چیز سیکھی۔ دیکھو میں نے داڑھی منڈوا دی بالوں میں تیل لگایا اور کنگھی کی۔ اور پھر بھی اے ناری، تھوڑی سی کسر رہ گی: بس اچھے کپڑے، اچھے جوتے اور پیسوں سے بھرا بٹوہ نہیں ہے۔ سدھارتھ نے ان چھوٹی موٹی چیزوں سے زیادہ مشکل چیزیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور انہیں حاصل کیا بھی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ میں وہ سب حاصل نہیں کر سکتا جس کا ارادہ میں نے کل کیا تھا۔ یعنی تمہارا دوست بننے اور تم سے محبت کی لذتوں کا سبق سیکھنے کا ارادہ۔ تم مجھے اچھا شاگرد پاؤ گی۔ تمہارے پاس جو کچھ سکھانے کے لئے ہے میں نے اس سے زیادہ مشکل چیزیں سیکھی ہیں۔ تو ان حالوں میں سدھارتھ تمہارے لئے قابل قبول نہیں ہے کیونکہ اس کے بالوں میں تیل تو لگا ہوا ہے مگر نہ اچھے کپڑے ہیں نہ جوتے نہ پیسے!''

کملا ہنسنے لگی۔ ''اوں ہوں۔ ابھی وہ اتنا اچھا نہیں ہے۔ اس کے پاس کپڑے ہوں، عمدہ کپڑے اور جوتے، عمدہ جوتے اور بٹوے میں بہت سارے پیسے ہوں اور کملا کے واسطے تحفے ہوں۔ اب سمجھے اے جنگل کے سادھو، اب تمہاری سمجھ میں آیا؟''

'میں خوب سمجھ گیا۔'' سدھارتھ بولا۔ ''میں ان لبوں کی کوئی بات سمجھنے سے کیسے قاصر رہ سکتا ہوں؟ تمہارے ہونٹ تازہ کٹے ہوئے انجیر کی طرح ہیں کملا۔ میرے ہونٹ بھی سرخ ہیں تازہ ہیں اور تم دیکھ لینا کہ تمہارے ہونٹوں پر کیسے کھلیں گے۔ لیکن، گوری، یہ تو بتاؤ کہ تم ابھی تک جنگل کے سادھو سے ڈر رہی جو تمہارے پاس محبت کے بھید سیکھنے آیا ہے؟''

''واہ میں کیوں ڈرنے لگی جنگل کے مورکھ سادھو سے جو گیدڑوں کے پاس سے اٹھ کر آیا ہے اور عورت ذات کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔''

''مگر وہ شکتی مان ہے اور نڈر ہے۔ وہ تمہارے ساتھ زبردستی کر سکتا ہے، چوری کر سکتا ہے، تمہیں چوٹ دے سکتا ہے۔''

''نہیں میں نہیں ڈرتی۔ بھلا کبھی کسی سادھو کو یا برہمن کو ڈر لگا ہے کہ کوئی آئے گا اور اسے مارے گا اور اس کی تپسیا، اس کا علم، اس کی فکر کی گہرائی چھین کر لے جائیگا؟ نہیں، کیوں کہ یہ ساری چیزیں اس کی اپنی ہوتی ہیں، اور ان میں سے وہ وہی دیتا ہے جو وہ دینا چاہتا ہے۔ بالکل یہی بات کملا اور کام رس کے ساتھ ہے۔ کملا کے ہونٹ سرخ ہیں اور تازہ ہیں لیکن اگر انہیں کملا کی مرضی کے بغیر چومنا چاہو تو ان سے مٹھاس کی ایک بوند نہیں ملے گی۔۔۔ حالاں کہ یہ لذت بخشنا خوب جانتے ہیں۔ تم اچھے شاگرد ہو سدھارتھ اس لئے یہ گرہ میں باندھ لو۔ پریم کی بھیک مانگی جا سکتی ہے، اسے خریدا جا سکتا ہے، یہ تحفے میں مل سکتا ہے، گلیوں بازاروں میں مل سکتا ہے، لیکن اسے چرایا نہیں جا سکتا۔ تم غلط سمجھے اور یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی کہ تم سا جوان بھی غلط سمجھنے لگے۔''

سدھارتھ جھکا اور مسکرا دیا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو کملا، یہ واقعی افسوس کی بات ہوگی۔ بہت افسوس کی بات ہوگی۔ تمہارے ہونٹوں سے مٹھاس کی ایک بوند بھی ضائع نہیں ہونی چاہیے اور نہ میرے ہونٹوں سے۔ سدھارتھ تمہارے پاس پھر آئے گا جب اس کے پاس وہ سب کچھ ہوگا جو اب نہیں ہے۔۔۔ کپڑے، جوتے، پیسے، لیکن اے سندری، یہ تو بتاؤ کہ کیا تم مجھے ذرا سا مشورہ نہیں دے سکتیں؟''

''مشورہ؟ کیوں نہیں؟ بھلا کون ہوگا جو ایسے بھک منگے، جاہل جنگلی سادھو کو خوشی خوشی نہ دے جو گیدڑوں کے پاس سے اٹھ کر آیا ہے۔''

''اے پیاری کملا، میں ان تین چیزوں کو جلد از جلد حاصل کرنے کے لئے کیا کروں، کہاں جاؤں؟''

''میرے دوست یہ تو بہت سے لوگ جاننا چاہتے ہیں۔ تم وہی کرو جو تم نے سیکھا ہے اور اسی سے پیسہ کماؤ۔ پھر اس سے کپڑے اور جوتے خریدو۔ غریب آدمی اس کے علاوہ اور کیا کرے گا؟''

''میں سوچ سکتا ہوں میں فاقہ کر سکتا ہوں۔''

''اور کچھ نہیں؟''

''کچھ نہیں ارے ہاں، میں کویتا لکھ سکتا ہوں۔ تم مجھے کویتا کے بدلے بوسہ دو گی؟''

''اگر کویتا پسند آئی تو۔ کیا شیر شک ہے اس کا؟''

سدھارتھ نے قدرے سوچا پھر کہا:

باغ میں ٹہلتی ہوئی آئی کملا
پھاٹک کنے کھڑا تھا جنگل کا سانولا سادھو
کنول کا پھول جو دیکھا اس نے تو جھک گیا تعظیم کے واسطے۔
مسکرائی جواب میں کملا

سادھو نے سوچا
کہ دیتاؤں کو چڑھاوے چڑھانے سے بہتر ہے۔
کہ گوری گوری کملا کو نذر دی جائے۔
کملا نے خوش ہو کر تالی بجائی اور اس کے سنہری کڑے جھنجھنا اٹھے۔
''اے سانولے سادھو تمہاری کویتا بہت اچھی ہے اور واقعی اگر میں تمہیں ایک بوسہ دے دوں تو کوئی حرج نہ ہوگا۔''
اس نے سدھارتھ کو اپنی آنکھوں سے دعوت دی۔ سدھارتھ نے اپنا چہرہ اس کے چہرے پر ٹکا دیا، اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے، اس کے ہونٹ جو تازہ کٹے ہوئے انجیر جیسے تھے۔ کملا نے لمبا بوسا لیا اور سدھارتھ کو بہت حیرت ہوئی کہ اس ایک بوسے میں وہ اسے کتنا کچھ سکھلا گئی، کس طرح اس پر قابو پایا، اسے دور کیا، پھر بلایا اور اس طویل بوسے کے بعد بوسوں کا ایک سلسلہ اس کا منتظر تھا، جس میں ہر بوسہ دوسرے بوسے سے منفرد تھا۔ وہ حیران کھڑا لمبے لمبے سانس بھرتا رہا۔ اس وقت وہ ایک بچے کی طرح تھا۔ جو علم اور ہنر کی دنیا اپنی آنکھوں کے سامنے کھلتے دیکھ کر اس کی وسعت پر حیران ہو رہا ہو۔
''تمہاری کویتا اچھی ہے۔'' کملا نے کہا۔ ''اگر میں دولت مند ہوتی تو تمہیں اس کے بدلے روپیہ دیتی۔ لیکن تمہیں کویتا کے ذریعے سے اتنی دھن دولت اکٹھا کرنے میں مشکل ہوگی کیونکہ اگر تمہیں کملا کا دوست بننا ہے تو اس کے لئے بہت پیسہ لگے گا۔''
''کیا بات ہے تمہارے بوسے میں، کملا۔'' سدھارتھ رک رک کر بولا۔
''اسی لئے تو میرے پاس چیزوں کی کمی نہیں ہے، کپڑے، لتے، زیور اور بہت ساری سندر چیزیں۔ مگر تم کیا کرو گے؟ تم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے کہ سوچو اور روزہ رکھو اور کویتا لکھو؟''
''مجھے اشلوک اور بھجن یاد ہیں۔'' سدھارتھ نے کہا۔ ''مگر میں انہیں اب نہیں گاؤں گا۔ مجھے منتر یاد ہیں مگر میں اب نہیں پڑھوں گا۔ میں نے وید پران پڑھے ہیں.....''
''ٹھیرو.....'' کملا بولی ''تم پڑھے لکھے ہو؟''
''بالکل۔ مگر ایسے تو بہت سارے لوگ ہیں۔''
''زیادہ نہیں ہیں ایسے لوگ۔ میں تو نہیں پڑھ سکتی۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم پڑھنا لکھنا جانتے ہو، بہت اچھا ہے۔ ہو سکتا ہے تمہیں منتروں کی بھی ضرورت پڑے۔''
اس وقت ایک نوکر آیا اور کملا کے کان میں کچھ کہنے لگا۔
کملا نے کہا: ''میرے پاس کوئی مہمان آیا ہے۔ اب تم جلدی سے غائب ہو جاؤ۔
کوئی تمہیں یہاں نہ دیکھ لے۔ اب میں کل پھر ملوں گی تم سے۔''
اس نے نوکر سے کہا کہ مقدس سادھو کو سفید لبادہ لا دو۔ سدھارتھ کو پتہ بھی نہ چلا کہ کیا ہو رہا ہے اور نوکر اسے باغیچے کے مکان تک لے آیا، ایک سفید لبادہ نکال کر دیا، درختوں کے جھنڈ تک پہنچا دیا اور کہنے لگا کہ اس باغ سے چپکے سے نکل جاؤ۔ سدھارتھ نے نہایت اطمینان کے ساتھ وہی کیا جو اس سے کہا گیا تھا۔ جنگل کا عادی تو وہ تھا ہی، چپکے سے پیڑوں میں سے ہوتا ہوا نکل آیا اور باڑھ لانگھ گیا۔ تہہ کیا ہوا لبادہ بغل میں دابے وہ شہر میں آیا۔ شہر میں وہ ایک سرائے کے دروازے پر کھڑا ہو گیا جہاں مسافروں کا ہجوم تھا اور خاموش کھڑے ہو کر بھیک مانگنے لگا، اور چاول کی روٹی بھیک میں ملی تو قبول کر لی۔ شاید مجھے کل کھانے کے لئے بھیک نہ مانگنی پڑے، اس نے سوچا۔
©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر7

اس کے دل پر فخر کے جذبات چھا گئے۔ اب وہ سادھو نہ تھا، اب اسے بھیک مانگنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس نے چاول کی روٹی ایک کتے کو ڈال دی اور خود بھوکا رہا۔

یہاں زندگی آسان ہے، سدھارتھ نے سوچا۔ اس میں کٹھنائیاں نہیں ہیں۔ جب میں سادھو تھا تو ہر چیز کٹھن تھی، ناگوار تھی اور بالآخر یاس انگیز تھی۔ اب ہر چیز سیدھی ہے، اتنی آسان جیسے بوسہ بازی کا وہ درس جو کملا نے مجھے منہ زبانی دیا۔ مجھے صرف کپڑے اور پیسے چاہئیں اور بس۔ یہ تو آسان چیزیں ہیں جن کا حصول آدمی کی نیند نہیں اڑا سکتا۔

اس نے کملا کے شہر والے مکان کا پتہ چلا لیا اور اگلے دن وہاں جا کر دستک دی۔

کملا نے پکار کر کہا کہ ''سب ٹھیک ہو رہا ہے، کام سوامی اس کی آمد کا منتظر ہے۔ وہ شہر کا سب سے بڑا دھنوان بیوپاری ہے۔ اگر وہ تم سے خوش ہوا تو تمہیں نوکر رکھ لے گا۔ سنا، سانولے سادھو! ذرا چالاکی دکھانا، میں نے کسی کے ذریعے سے تمہارا ذکر پہنچایا تھا اس تک۔ اس سے دوستی کر لو، بہت با اثر آدمی ہے، مگر زیادہ عاجزی مت دکھانا۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ تم اس کے نوکر بنو بلکہ یہ کہ تم اس کے برابر آ جاؤ۔ ورنہ میں تم سے راضی نہیں ہوں گی۔ کام سوامی بڈھا ہو رہا ہے اور مجہول ہو گیا ہے۔ اگر تم نے اس کو خوش کر دیا تو وہ تم پر بھروسہ کرنے لگے گا۔''

سدھارتھ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہنسا، اور جب کملا کو پتہ چلا کہ اس نے نہ آج کھایا ہے نہ کل کھایا تھا تو اس کے واسطے روٹی اور پھل منگوائے اور اس کی خاطر داری کی۔

جاتے وقت وہ اس سے بولی: ''تم بڑے بھاگوان ہو۔ ایک کے بعد دوسرا دروازہ تمہارے لئے کھل رہا ہے۔ یہ کیسے ہو جاتا ہے، کوئی جادو ہے تمہارے پاس؟''

سدھارتھ نے کہا: ''کل میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے سوچنا آتا ہے، انتظار کرنا آتا ہے، فاقہ کرنا آتا ہے۔ مگر تم نے ان کو ہنر نہیں سمجھا۔ تم دیکھ لینا کہ یہ کتنے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ تم دیکھو گی کہ جنگل کے نادان سادھو بھی بہت ساری کام کی باتیں سیکھ لیتے اور جان جاتے ہیں۔ پرسوں تک میں پھٹے حالوں والا بھکاری تھا اور کل کملا کو چوم رہا تھا اور جلد ہی میں بیوپاری ہو جاؤں گا، پھر میرے پاس پیسہ ہو گا اور وہ ساری چیزیں جنہیں تم اہمیت دیتی ہو۔''

''درست۔'' وہ بولی۔ ''مگر میرے بغیر تم کیا کرتے؟ اگر کملا نے تمہاری مدد نہ کی ہوتی تو تم کہاں جاتے؟''

''میری پیاری کملا!'' سدھارتھ بولا ''جب میں تمہارے باغ میں آیا تو یہ پہلا قدم تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ سب سے سندر ناری سے کام ودیا حاصل کروں گا۔ جس لمحے میں نے یہ ارادہ کر لیا تبھی سے مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں اسے پورا کر کے دم لوں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری مدد کرو گی۔ مجھے یہ بات تمہاری پہلی نظر سے معلوم ہو گئی تھی جب میں تمہارے راستے میں باغ کے پھاٹک پر کھڑا تھا۔''

''اور اگر میں ایسا نہ چاہتی تو؟''

''مگر تم نے ایسا چاہا، سنو، کملا، جب پتھر پانی میں پھینکا جاتا ہے تو وہ تہہ تک ڈوب جانے کا مختصر ترین راستہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ یہی بات سدھارتھ کے ساتھ ہوتی ہے جب اس کے سامنے کوئی مقصد، کوئی ارادہ ہوتا ہے۔ سدھارتھ کو کچھ نہیں کرنا پڑتا، وہ انتظار کرتا ہے، سوچتا ہے اور فاقہ کرتا ہے، اور دنیا کے دھندوں سے یوں گزر جاتا ہے جیسے پانی میں پتھر۔۔۔ بغیر کئے، بغیر ہلے چلے، اسے کھینچ لیا جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو گرنے دیتا ہے۔ اسے اس کا مقصد کھینچتا ہے کیوں کہ وہ اپنے من میں ایسی کسی چیز کو نہیں آنے دیتا جو اس کے مقصد کی مخالف ہو۔ یہی سیکھا تھا سدھارتھ نے سادھوؤں سے۔ یہی وہ چیز ہے جسے کم عقل لوگ جادو کہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ بھوتوں کی کارستانی ہے۔ بھوت کچھ نہیں کرتے، بھوت کچھ نہیں ہوتے۔ ہر شخص جادو کر سکتا ہے، ہر شخص اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے، بشرطیکہ وہ سوچے، انتظار کرے۔'' کملا اس کی باتیں سنتی رہی۔ کملا کو اس کی آواز سے پریم ہو گیا، کملا اس کی آنکھوں سے پریم کرنے لگی۔

''دوست شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''یا شاید اس کی وجہ سے یہ ہو کہ سدھارتھ خوبرو ہے، اس کی نظریں ناریوں کے دلوں کو گرما جاتی ہیں اور یہ کہ وہ بہت بھاگوان ہے۔''

سدھارتھ نے اسے بوسہ دیا اور الوداع کہا۔ ''یہی سہی، اے میری استانی۔ میری نظر سے تم ہمیشہ خوش رہو اور مجھ تک میری خوش قسمتی پہنچے بھی تو ہمیشہ تمہارے وسیلے سے!''

لوگوں کے درمیان

سدھارتھ کام سوامی تاجر سے ملنے گیا اور اس کے شاندار مکان پر پہنچا۔ نوکروں نے بیش قیمت قالینوں پر سے گزرتے ہوئے اسے ایک علیحدہ کمرے میں بٹھا دیا جہاں وہ گھر کے مالک کا انتظار کرنے لگا۔

کام سوامی اندر آیا، نرم صورت، زندہ دل آدمی جس کے بال سفید ہو چلے تھے، آنکھیں چوکس تھیں اور ہونٹ شہوت

انگیز۔گھر کے مالک اور گھر کے مہمان نے ایک دوسرے کو پرنام کیا۔
بیوپاری بولا: ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم برہمن ہو، قابل آدمی ہو، مگر تاجروں کی نوکری ڈھونڈتے ہو۔اے برہمن، کیا تم ضرورت مند ہو جو نوکری ڈھونڈتے ہو؟''
''نہیں۔''سدھارتھ نے جواب دیا۔''میں ضرورت مند نہیں ہوں نہ کبھی ضرورت مند رہا ہوں۔ میں مدت تک سادھوؤں کے پاس رہا اور اب وہاں سے لوٹ آیا ہوں۔''
اگر تم سادھوؤں کے پاس سے آ رہے ہو تو پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم ضرورت مند نہ ہو؟ سادھو اشیاء کی ملکیت سے محروم نہیں ہوتے''
''میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے، اگر تمہاری مراد یہی ہے۔''سدھارتھ نے کہا۔''میں یقیناً اشیاء سے محروم ہوں۔ مگر یہ میری مرضی اور خواہش سے ہوا ہے، اسی لئے میں ضرورت مند نہیں ہوں۔''
''لیکن اگر تمہارے پاس کچھ نہیں ہے تو تم رہو گے کیسے؟''
''اس کے متعلق تو میں نے کبھی نہیں سوچا۔ تین برس سے میں اشیا کے بغیر رہ رہا ہوں اور مجھے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ میں کیسے زندہ رہوں گا۔''
''تو تم دوسروں کی چیزوں کے بل بوتے پر زندہ ہو؟''
''بظاہر یہی لگتا ہے۔ بیوپاری بھی تو دوسروں کی چیزوں پر زندہ رہتے ہیں۔''
''خوب کہا۔مگر بیوپاری دوسروں سے کچھ مفت میں نہیں لیتا، بلکہ معاوضے میں اپنا مال بھی دیتا ہے۔''
''یہی تو ہے چیزوں کا تبادلہ۔ہر شخص کچھ لیتا ہے، ہر شخص کچھ دیتا ہے۔یہی زندگی ہے۔''
''ہوں، مگر تمہارے پاس کیا ہے، تم بھلا کیا دو گے؟''
''ہر شخص وہی دیتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ سپاہی اپنی قوت دیتا ہے، بیوپاری اپنا مال اسباب، استاد علم دیتا ہے، کسان چاول اور مچھیرا مچھلی۔''
''ٹھیک ہے، تم کیا دو گے؟''تم نے ایسی کونسی چیز سیکھی ہے جو تم دوسروں کو دے سکتے ہو؟''
''میں سوچ سکتا ہوں، انتظار کر سکتا ہوں، فاقہ کر سکتا ہوں۔''
''بس یہی؟''
''ہاں، میرا خیال ہے کہ صرف اتنا ہی۔''
''تو کیا فائدہ ہے ان سب کا؟ مثلاً یہ فاقہ کرنا، اس سے بھلا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟''
''جناب، اس کے بہت فائدے ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس کھانے کو کچھ نہ ہو تو وہ فاقہ کرنے سے زیادہ دانش مندانہ کام نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر سدھارتھ نے فاقہ کرنا اور برت رکھنا نہ سیکھا ہوتا تو آج اسے کسی قسم کی مزدوری ڈھونڈنا پڑتی، یا تو آپ کے پاس یا کہیں اور، کیوں کہ وہ اپنی بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا۔مگر اب سدھارتھ آرام سے انتظار کر سکتا ہے، وہ بے صبری نہیں کر رہا، اسے کوئی ضرورت نہیں ہے، بھوک کو دور بھگا سکتا ہے اور اس پر ہنس سکتا ہے۔اس لئے برت رکھنا بھی مفید ہے۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو، سادھو۔ ذرا ٹھیرو۔''
کام سوامی باہر گیا اور ایک لپٹا ہوا کاغذ لے کر آیا جو اس نے مہمان کو پکڑا دیا اور پوچھا:''تم اسے پڑھ سکتے ہو''
سدھارتھ نے کاغذ دیکھا، اس پر کھاتا لکھا ہوا تھا جو اس نے پڑھنا شروع کر دیا۔''بہت خوب۔'' کام سوامی نے کہا۔''اور اب تم اس کاغذ پر میرے لئے کچھ لکھو گے''
اس نے کاغذ اور قلم دیا اور سدھارتھ نے اس پر لکھ کر اسے واپس کر دیا۔
کام سوامی نے پڑھا۔''لکھنا اچھا ہے، سوچنا اس سے بہتر۔ہوشیاری اچھی ہے، صبر اس سے بہتر۔''
''تم بہت اچھا لکھتے ہو۔''بیوپاری اس کی تعریف کرنے لگا۔''ہمیں بہت سی باتیں طے کرنی ہوں گی مگر آج میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ میرے مہمان بنو اور میرے گھر قیام کرو۔''
سدھارتھ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی دعوت قبول کر لی۔اب وہ اس دھنوان بیوپاری کے گھر رہنے لگا۔اس کے لئے جوتے اور کپڑے لائے گئے اور ایک نوکر روزانہ اس کے اشنان کے لئے پانی گرم کرتا۔ انواع واقسام کے کھانے دن میں دوبارہ اس کے سامنے لائے جاتے مگر سدھارتھ دن میں ایک مرتبہ کھانا کھاتا، اور تب بھی نہ گوشت چھوتا نہ شراب چکھتا۔کام سوامی نے اسے اپنے بیوپار کے بارے میں بتایا، اپنا اسباب اور گودام اور بہی کھاتا دکھایا۔سدھارتھ نے بہت سی نئی باتیں سیکھیں، اس نے سنا زیادہ اور کہا کم۔اور کملا کے شبدیاد کرتے ہوئے وہ کبھی اس پونجی پتی بیوپاری کا دست نگر بن کے نہیں رہا۔ بلکہ اس سے اپنا احترام کروایا تا کہ وہ اس کے ساتھ برابری کا سلوک کرے، اپنے برابر سمجھے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔کام سوامی اپنا بیوپار بہت دیکھ دیکھ، احتیاط اور بعض

اوقات جوش وولولے کے ساتھ چلاتا تھا مگر سدھارتھ اس کو کھیل سمجھتا تھا، ایسا کھیل جس کے اصول وہ کوشش کر کے سیکھنا چاہتا تھا مگر جو اس کے دل کو چھو نہیں سکے تھے۔

کام سوامی کے گھر اس کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ اپنے مالک کے کاروبار میں ہاتھ بٹانے لگا۔لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ وقت مقررہ پر روزانہ عمدہ کپڑے اور نفیس جوتے پہن کر اور قیمتی تحفے لے کر کملا سے ملنے جاتا۔اس نے کملا کے لال، چاتر ہونٹوں سے بہت سی باتیں سیکھیں۔کملا کے کول ہاتھوں نیا سے بہت سی باتیں سکھائیں۔وہ جو محبت کے معاملے میں ابھی تک بالا تھا اور اس کی تہہ دار گہرائیوں میں نا سمجھی اور بے تابی کے مارے ڈوب جانا چاہتا تھا، اسے کملا نے سکھایا کہ لذت حاصل کرنے کے لئے دنیا بھی ضروری ہے، اور یہ کہ ہر اشارے، ہر ادا، ہر لمس، ہر نگاہ، شریر کے ایک ایک انگ کا اپنا بھید بھاؤ ہوتا ہے جو جاننے والے کو لذت بخش سکتا ہے۔کملا نے اسے سکھایا کہ پریمی اور پریمیکا کو ملاپ کے بعد ایک دوسرے کو سراہے بغیر الگ نہیں ہونا چاہیے، فتح کرنے کے ساتھ فتح بھی ہو جانا چاہیے تاکہ دل بھر جائے اور بے کسی اور سونے پن کا احساس نہ پیدا ہو اور نہ یہ بھیانک احساس ہو کہ کسی کے ساتھ بدسلوکی کی ہے، یا اپنے ساتھ بدسلوکی ہوئی ہے۔سدھارتھ نے اس من موہنی چاتر کنجنی کے ساتھ بہت پیاری گھڑیاں گزاریں، اور اس کا شاگرد، اس کا پریمی، اسکا دوست بن گیا۔کملا کے ساتھ ہی اس کی موجودہ زندگی کی افادیت اور معنویت تھی، کام سوامی کے بیوپار میں نہیں۔

کام سوامی نے اہم خطوط کی جواب دہی اور احکامات صادر کرنا سدھارتھ کے سپرد کر دیئے اور تمام اہم معاملات میں اس سے مشورہ کرنے لگا۔اس نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ سدھارتھ کو چاول اور اون، جہاز رانی اور تجارت کے بارے میں بہت کم معلوم ہے مگر اس میں ایک ہنر ہے، وہ اطمینان اور سکون قلب کے معاملے میں اس بیوپاری سے بڑھا ہوا ہے، اسے اجنبی لوگوں کی گفتگو سننے اور ان پر اچھا تاثر مرتب کرنے کا کمال آتا تھا۔کام سوامی نے اپنے ایک دوست سے کہا: ''براہمن حقیقی طور پر تاجر نہیں ہے اور نہ بن سکے گا، وہ اپنے بیوپار میں ڈوب نہیں جاتا۔مگر اس میں یہ وصف ہے کہ کامیابی خود چل کے اس کے پاس آتی ہے، چاہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ ''شبھ ستاروں'' کے اثر میں پیدا ہوا تھا یا یہ کوئی جادو ہے، یا پھر یہ بھی اس نے سادھوؤں سے سیکھا ہو گا۔بیوپار میں ہمیشہ یوں لگتا ہے کہ وہ کھیل رہا ہے، یہ نہیں لگتا کہ کاروبار نے اس پر کوئی اثر ڈالا یا اس کو اپنی گرفت میں لے آیا ہو، اسے کبھی ناکامی کا خوف نہیں ہوتا نہ وہ گھاٹے کی فکر کرتا ہے۔''

اس دوست نے کام سوامی کو مشورہ دیا: ''یوں کرو جس بیوپار میں وہ تمہارا ہاتھ بٹاتا ہے اس کے منافعے میں سے اس کو ایک تہائی دے دو، اور اگر گھاٹا ہو تو اسی حساب سے وہ نقصان میں شریک رہے، اس طرح وہ بیوپار میں زیادہ دلچسپی لے گا۔'' کام سوامی نے اس مشورے پر عمل کیا، مگر سدھارتھ اتنا ہی بے تعلق رہا۔اگر کاروبار میں نفع ہوتا تو سکون سے قبول کر لیتا، اگر گھاٹا ہوتا تو وہ ہنستا اور کہتا: ''اچھا چلو، یہ کام ٹھیک نہیں ہوا۔''

درحقیقت وہ بیوپار سے خاصا بے تعلق نظر آتا تھا۔ایک دفعہ اس نے گاؤں کا سفر کیا کہ دھان کی فصل کا سودا کرے۔جب وہ وہاں پہنچا تو فصل کا سودا ایک اور بیوپاری سے ہو چکا تھا۔پھر بھی سدھارتھ اس گاؤں میں کئی دن تک ٹھہرا رہا، کسانوں سے گپ لڑاتا رہا، بچوں میں پیسے بانٹتا رہا، ایک شادی میں شریک ہوا اور بہت نچنت ہو کر واپس لوٹا۔کام سوامی نے اسے سرزنش کی کہ وہ فوراً کیوں نہ واپس آ گیا، اور اتنا پیسہ اور وقت برباد کیا۔سدھارتھ نے جواب دیا: ''میرے عزیز دوست، مجھے ڈانٹو نہیں۔بگڑنے اور ڈانٹنے سے کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔اگر نقصان ہوا ہے تو نقصان میں اٹھاؤں گا۔میں اپنے سفر سے بہت مطمئن ہوں۔میں اتنے سارے لوگوں سے ملا، ایک برہمن سے دوستی کی بچوں کو گود میں بٹھایا اور کسانوں نے مجھے اپنے کھیت دکھائے۔کسی نے بھی مجھے بیوپاری نہیں سمجھا۔''

©۔جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر8

''یہ سب ٹھیک ہے'' کام سوامی نے بہت پس و پیش کے بعد اعتراف کیا''مگر تم اصل میں ہوتو بیوپاری۔ یاتم صرف تفریح کے لئے سفر کر رہے تھے؟''

سدھارتھ ہنسا۔''یقیناً میں نے اپنی تفریح کے لئے سفر کیا۔ اور کیوں نہ کرتا؟ میں نئی تحصیلوں نئے لوگوں سے واقف ہوا۔ مجھے لوگوں کا بھروسہ اور دوستی ملی۔ اور اگر میرا نام کام سوامی ہوتا تو میں وہاں سے فوراً یہ سوچ کر بگڑتا ہوا واپس ہولیتا کہ چار پیسے کی چیز نہیں خرید سکا، پھر واقعی میرا وقت اور پیسہ برباد ہوا ہوتا۔ مگر میں نے کئی اچھے دن گزارے، کافی سیکھا، بہت مزہ آیا اور اپنی جلد بازی یا جھنجھناہٹ سے میں نے نہ خود نقصان اٹھایا نہ کسی کو نقصان پہنچایا۔ اور اگر میں کبھی وہاں دوبارہ گیا۔ اگلی کوئی فصل خریدنے یا کسی اور کام سے، تو لوگ خوش ہو کر میرا سواگت کریں گے، آؤ بھگت کریں گے اور میں بھی خوش ہوں گا کہ میں نے پہلے چال بازی اور ناراضگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہر حال، یہ بات یہیں رہنے دو اے دوست، اور بگڑ کر خود کو نہ بگاڑو۔ اگر کوئی ایسا دن آئے جب تم سوچنے لگو کہ سدھارتھ تمہیں نقصان پہنچا رہا ہے تو بس ایک لفظ کہہ دینا اور سدھارتھ اپنے راستے پر چلا جائے گا۔ تو آؤ جب تک ہم اچھے دوست بنے رہیں۔''

کام سوامی نے سدھارتھ کو یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی کہ تم میری روٹیاں توڑ رہے ہو، مگر بے سود، سدھارتھ تو اپنی روٹی کھاتا تھا، مزید یہ کہ سب ایک دوسرے کی روٹی کھاتے ہیں، ہر ایک کی روٹی کھاتے ہیں۔ سدھارتھ کو کام سوامی کی پریشانیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا، اور کام سوامی کو بہت پریشانیاں لاحق تھیں۔ اگر کوئی سودا گھاٹے میں جاتا ہوا لگتا، یا اسباب تجارت گم ہو جاتا، یا کوئی مقروض وقت پر قرض نہ ادا کر سکتا تو ایسے وقتوں میں کام سوامی سدھارتھ کو یہ باور نہیں کرا سکا کہ غصے اور کرودھ کے کڑوے شبدوں سے کوئی مقصد حال ہو سکتا ہے، یا تیوری پر بل ڈالنے یا نیند خراب کرنے سے کچھ حاصل ہے۔ ایک مرتبہ جب کام سوامی نے اسے جتایا کہ تم نے سب کچھ مجھ سے سیکھا ہے تو اس نے جواب دیا:''مذاق نہ کرو۔ میں نے تم سے یہ سیکھا ہے کہ مچھلیوں کے ٹوکرے کے کیا دام ہیں اور روپیہ قرض پر چڑھانے سے کتنا بیاج مل سکتا ہے۔ تمہیں یہی معلوم ہے۔ مگر میں نے سوچنا تم سے نہیں سیکھا۔ بہتر ہوگا کہ یہ تم مجھ سے سیکھ لو۔''

واقعی کاروبار میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ مگر اسے اس کی ضرورت تھی تاکہ وہ کملا کے لئے روپیہ کما سکے، اور وہ اپنی ضرورت سے زیادہ کما بھی رہا تھا۔ اور اس کے علاوہ سدھارتھ کی ہمدردیاں اور اس کا تجسس عام لوگوں کے ساتھ تھا جن کے کام کاج، دکھ سکھ اس کے لئے اتنے ہی انجانے اور دور دراز تھے جیسے آسمان کا چاند۔ حالانکہ وہ باآسانی لوگوں میں گھل مل جاتا، ہر ایک سے باتیں کر لیتا، ہر ایک کے ساتھ رہ سکتا تھا، ہر ایک سے سیکھ سکتا تھا پھر بھی اسے اس بات کا بہت احساس تھا کہ ایسی کوئی چیز تھی جو اس کو ان سب سے جدا کرتی تھی۔۔۔ اور وہ اس وجہ سے کہ وہ سادھو رہا تھا۔ وہ دیکھتا کہ لوگ بالکل بچوں کی طرح یا جانوروں کی طرح رہ رہے ہیں، اور وہ اس بات کو بیک وقت پسند بھی کرتا اور برا بھی سمجھتا، وہ دیکھتا کہ یہ لوگ مشقت کرتے ہیں، دکھ بھوگتے ہیں اور بوڑھے ہو جاتے ہیں، محض ان چیزوں کی خاطر جو سدھارتھ کو ان داموں مہنگی معلوم ہوتیں۔ روپیہ پیسہ۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور گھٹیا اعزاز۔ وہ دیکھتا کہ لوگ ایک دوسرے پر بگڑتے ہیں اور ایک دوسرے کو آزار پہنچاتے ہیں، اس نے دیکھا کہ لوگ ایسی تکلیفوں پر ہاہا کار مچاتے ہیں جن پر سادھو ہنستے ہیں اور ان محرومیوں پر کڑھتے ہیں جن کا سادھوؤں کو احساس بھی نہیں ہوتا۔

لوگ جو کچھ بھی اس کے پاس لے کر آتے وہ قبول کر لیتا۔ وہ بیوپاری جو اس کے پاس ململ کے تھان بیچنے لے کر آتا، سدھارتھ اس کا بھی سواگت کرتا اور جو آدمی ادھار مانگنے آتا اسے بھی خوش آمدید کہتا، اور جو بھکاری بھیک مانگنے آتا اور گھنٹہ بھر اس کے پاس بیٹھ کر اپنی رام کہانی سنائے چلا جاتا حالاں کہ وہ سادھوؤں جتنا غریب نہ ہوتا۔ باہر سے آنے والے پونجی پتی بیوپاریوں سے وہ ایسا برتاؤ کرتا جیسے اپنی حجامت بنانیوالے ملازم سے اور ان پھیری والوں سے جن سے وہ کیلے خریدتا ہے اور جن کو وہ چار پیسے کی ہیرا پھیری کرنے دیتا ہے۔ کبھی کام سوامی اس کے پاس آتا اور اپنا دکھڑا سناتا یا کسی سودے کے بارے میں سرزنش کرتا تو سدھارتھ توجہ اور تجسس سے سنتا، سمجھنے کی کوشش کرتا، جہاں ضروری ہوتا وہاں ذرا سا دب جاتا اور اس کی سن کر اگلے آدمی کی طرف رجوع ہوتا۔ اور بہت لوگ آتے تھے اس کے پاس۔۔۔ کچھ اس کے ساتھ بیوپار کرنے، کچھ اسے دھوکا دینے، بہت سے بس اس کی بات سننے، بہت سے ہمدردی کی تلاش میں اور بہت سے لوگ اس سے مشورے مانگنے۔ وہ مشورے بھی دیتا، ہمدردی بھی کرتا، تحفے بھی دیتا اور کبھی کبھار جان بوجھ کر دھوکا بھی کھالیتا اور اپنے خیالوں میں اس کھیل کو بسائے رکھتا جسے دنیا کے لوگ اتنے انہماک اور شدت کے ساتھ کھیلتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے پہلے وہ اپنے خیالوں میں خدا اور برہما کو بسائے رہتا تھا۔

بعض اوقات اسے اپنے بھیتر ایک کومل آواز سنائی دیتی جو اسے دھیرے سے یاد دلاتی، شکایت کرتی، اتنے دھیرے سے کہ وہ آسانی کے ساتھ سن بھی نہ پاتا۔ پھر اسے صاف نظر آ گیا کہ وہ عجیب سی زندگی گزار رہا ہے، یہ کہ وہ ایسے کام کر رہا ہے جو بس کھیل ہیں، وہ خوش رہتا اور بعض اوقات اسے ان میں مزہ بھی آتا مگر اصلی زندگی، حقیقی زندگی اس کے پاس سے بہتی جا رہی تھی، اسے چھوئے بغیر ۔۔۔۔ اس کھلاڑی کی طرح جو گیند سے کھیلتا ہے وہ اپنے بیوپار سے کھیل رہا تھا، ان لوگوں سے کھیل رہا تھا جو اس کے چاروں طرف جمع تھے، ان کو دیکھتا تھا اور ان سے تفریح لیتا تھا، مگر وہ دل سے وہاں نہیں تھا، اس کی فطرت وہاں کی نہیں تھی۔ اس کی حقیقی ذات کہیں اور بھٹکتی پھرتی، دور دراز، کسی کو نظر آئے بنا ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی اور اس کا اس زندگی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بعض اوقات وہ ان خیالات سے ڈر جاتا اور چاہتا کہ وہ روزمرہ کی ان بچگانہ چیزوں میں اسی شدت کے ساتھ ملوث ہو سکے، ان میں پوری طرح شریک ہو سکے، اوروں کی طرح اس زندگی سے لطف اندوز ہو سکے، اس کو گزار سکے، دور کا تماشائی نہ بنا رہے۔

وہ بہت پابندی کے ساتھ من بھاونی کملا کے پاس جاتا، اس سے کام شاستر سیکھتا کہ یہی وہ شاستر ہے جس میں لینا اور دینا اور ایک بن جاتے ہیں۔ اس سے باتیں کرتا، اس سے سیکھتا، اس سے مشورے لیتا اور اس کو مشورے دیا کرتا۔ وہ اس کو اتنی اچھی طرح سمجھ گئی تھی جتنا کہ گووند بھی کبھی سمجھ نہیں پایا۔ وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ اس جیسی تھی۔

ایک دفعہ وہ اس سے بولا: ''تم میری ہو، تم اوروں سے مختلف ہو۔ تم کملا ہو، کوئی اور نہیں ہو، تمہارے بھیتر اتنی شونتا اور شانتی ہے جس کی طرف تم لوٹ سکتی ہو، پناہ ڈھونڈ سکتی ہو، جہاں تم، تم ہو سکتی ہو، میری طرح۔ بہت کم لوگوں میں یہ سمرتھ ہوتی ہے، حالاں کہ یہ ہر ایک میں پیدا ہو سکتی ہے۔''

''ہر ایک ہوشیار نہیں ہوتا۔'' کملا نے کہا۔

''اس کا چترائی سے تعلق نہیں، کملا۔'' سدھارتھ نے کہا۔ ''کام سوامی میرے جتنا چالاک ہے مگر اس کے بھیتر وہ شانتی نہیں ہے۔ اور یہ چیز بعض ایسے لوگوں میں ہوتی ہے جو ہر چیز میں بالکل بچے ہوتے ہیں۔ کملا، زیادہ تر لوگ گرتے پتے کی طرح ہوتے ہیں جو ہوا میں اڑتا پھرتا ہے، گھومتا ہے، پھڑ پھڑاتا ہے، زمین پر گر جاتا ہے۔ مگر کچھ لوگ ستاروں کی طرح ہوتے ہیں اور جانے بوجھے راستے پر سفر کرتے ہیں، ان کو ہوا کا کوئی جھونکا متاثر نہیں کرتا، اور ان کے اندر آپ اپنا راہنما اور آپ اپنی راہ ہوتی ہے۔ میں جتنے دانش مند لوگوں سے ملا، اور میں نے بہت دانش مند دیکھے ہیں، ان میں ایک شخص ایسا تھا جو اس چیز میں کامل اور اکمل تھا۔ وہ ہے گوتم، تتھاگت گوتم بدھ، شاکیہ منی جو اس مسلک کا پرچار کرتا ہے۔ ہر روز ہزاروں کی تعداد میں نوجوان لوگ اسے سکھشا لیتے ہیں اور ہر گھڑی اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں، وہ سب گرتے پتے ہیں! ان کے اپنے اندر وہ دانش اور وہ راستہ نہیں ہے۔

کملا نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ''تم پھر اس کا ذکر رہے ہو۔'' وہ بولی۔ ''پھر تمہارے من میں سادھوؤں کے خیالات آ رہے ہیں۔''

سدھارتھ چپ ہو رہا اور وہ دونوں پریم کا کھیل کھیلنے لگے، یہ بھی ان تیس چالیس مختلف کھیلوں میں سے تھا جو کملا کو آتے تھے۔ اس کا بدن چیتے کا سا پھرتیلا اور چڑھی کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ جو بھی اس سے پریم کے بارے میں سیکھتا نت نئے رس، نت نئے بھید بھاؤ جانتا۔ وہ دیر تک سدھارتھ سے کھیلتی رہی، کبھی اسے ٹھکرا دیتی، کبھی اس پر چھاتی، اسے فتح کر لیتی، وہ اس سے زیر ہو کر خوش ہونے لگتا یہاں تک کہ مغلوب ہو جاتا اور تھک کر اس کے پہلو میں گر پڑتا۔

وہ کنچنی اس پر جھک گئی اور دیر تک اس کے چہرے کو تکتی رہی، اس کی تھکی ہوئی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔

''تم سے بہتر پریمی مجھے کوئی نہیں ملا۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''تم اوروں سے زیادہ شکتی مان ہو، تمہارا شریر لوچ دار ہے، تم زیادہ رضامند ہو۔ سدھارتھ، تم نے میرا فن خوب سیکھا ہے۔ کسی دن جب میری عمر زیادہ ہو گی تو میرا تم سے ایک بچہ ہو گا۔ پھر بھی جان من تم بھیتر سے ابھی تک سادھو ہو۔ درحقیقت تم مجھ سے پریم نہیں کرتے۔ تم کسی سے بھی پریم نہیں کرتے۔ کیا یہ سچ نہیں؟''

''شاید۔'' سدھارتھ نے تھکے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ تم بھی کسی سے پریم نہیں کر سکتیں، ورنہ پھر تم پریم کو فن کی طرح نہ برتتیں۔ شاید ہم جیسے آدمی پریم نہیں کر سکتے۔ عام لوگ پریم کر سکتے ہیں۔ یہی ان کا بھید ہے۔''

سنسار

بہت عرصے تک سدھارتھ دنیا میں شامل ہوئے بغیر دنیاوی زندگی گزارتا رہا۔ اس کے احساسات، جو سادھوؤں کی تپسیا میں مردہ ہو گئے تھے، پھر سے جاگ اٹھے۔ وہ دولت، طاقت اور محبت کے ذائقے چکھتا تھا مگر بہت حد تک من

میں وہ سادھو ہی رہا۔ کملا ہوشیار تھی جو اس بت کو جان گئی تھی کہ اس کی زندگی ہمیشہ سوچنے، انتظار کرنے اور برت رکھنے کے فنون سے متعین ہے اور دنیا والے، یہ عام لوگ اس کے لئے ابھی اتنے ہی اجنبی تھے جیسے وہ ان سے پہلے تھے۔

برس بیت گئے۔ دن بھر کی آسائشوں کے درمیان سدھارتھ کو ان کے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ وہ پونجی پتی بن چکا تھا۔ بہت عرصے سے اس کی اپنی کوٹھی تھی، نوکر چاکر تھے، شہر کے مضافات میں دریا کنارے باغ تھا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے، پیسہ یا مشورہ چاہیے ہوتا تو اس کے پاس آتے۔ لیکن کملا کے سوا اس کا کوئی قریبی دوست نہ تھا۔

وہ وشال نروان جس کا شاندار تجربہ اسے نوجوانی میں ایک مرتبہ ہوا تھا گوتم کی سکھشا لینے کے بعد، گووند سے بچھڑنے کے بعد، وہ پرشوق توقع، وہ تمام گروؤں اور عقاید کے بغیر اکیلے کھڑے رہنے کا فخر، وہ چوکس اور تیار رہنا کہ الوہی آواز اپنے من کے بھیتر سن لے، وہ سب رفتہ رفتہ یادیں بن کر رہ گئی تھیں، گزر چکی تھیں۔ وہ پھوٹتا چشمہ جو کبھی اتنے پاس تھا اور کبھی آپ اس کے بھیتر گنگناتا، اب وہ دور سے دھیرے دھیرے مدھم گاتا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت سی باتیں جو اس نے مختلف ذرائع سے سیکھی تھیں، سادھوؤں سے، گوتم سے، اپنے باپ سے، اپنے برہمن اساتذہ سے، وہ بہت دنوں تک برقرار رہیں: میانہ روی کی زندگی، لذت فکر، گیان دھیان میں ایک خاص وقت گزارنے کی عادت اور اس ذات کا خفیہ علم، اس ابدی ذات کا علم جو نہ جسم تھی نہ شعور۔ ان میں سے بہت سی باتیں باقی رہ گئی تھیں، کچھ تہہ میں بیٹھ گئی تھیں، کچھ پر گرد جم گئی تھی۔ جس طرح کمہار کا چاک جب ایک دفعہ گھومنے لگتا ہے تو بہت دیر تک گھومتا رہتا ہے پھر آہستہ ہو جاتا ہے پھر رک جاتا ہے، اسی طرح تو بہت دیر تک گھومتا رہتا ہے پھر آہستہ ہو جاتا ہے پھر رک جاتا ہے، اسی طرح سادھنا کا چکر، سوچ کا چکر، تفریق و امتیاز کا چکر، سدھارتھ کی آتما میں مدت تک گھومتا رہا، وہ اب بھی گھومتا تھا، مگر آہستہ آہستہ اور رک رک کر، اور بس بالکل تھم جانے کو تھا۔ دھیرے دھیرے جیسے مرتے ہوئے پیڑ کے تنے میں پانی داخل ہوتا ہے، آہستہ آہستہ اس کو بھر دیتا ہے اور گلا دیتا ہے، اسی طرح دنیا اور تساہل سدھارتھ کی روح میں داخل ہونے لگے، اس کی روح میں بھرنے لگے، اس کو بھاری بھرکم بنا دیا، اس کو تھکا دیا، اس کو گہری نیند سلا دیا۔ مگر دوسری طرف اس کے حواس جاگ اٹھے، نت نئے باتیں سیکھتے اور بہت تجربے حاصل کرتے۔

سدھارتھ نے اب سیکھ لیا تھا کہ بیوپار میں سودے کیسے کئے جائیں، لوگوں پر اپنی شکتی کس طرح جتائی جائے، عورتوں سے تفریح کیونکر لی جائے، اس نے سیکھ لیا تھا کہ عمدہ کپڑے کیسے پہنے جائیں، نوکروں پر حکم کیسے چلایا جائے، اور کیسے سگھند ش پانی میں اشنان کیا جائے۔ وہ سیکھ گیا تھا کہ کس طرح میٹھے اور عمدہ پکوان، مچھلی اور مرغ اور ماس اور مصالحے اور ترنوالے، کھائے جائیں اور مدراپی جائے جو اسے کامل اور بھلکڑ بنا دیتی۔ اس نے پانسا پھینکنا اور شطرنج کھیلنا سیکھ لیا، اور ناچ دیکھنا اور پالکیوں میں سواری کرنا اور نرم بچھونے پر سونا سیکھ لیا۔ مگر وہ ہمیشہ خود کو دوسروں سے مختلف اور بہتر پاتا، وہ ہمیشہ انہیں کچھ حقارت سے، کچھ تنفر کی نظر سے دیکھتا، ایسی حقارت جو جنگل کا سادھو دنیا والوں کے لئے محسوس کرتا ہے۔ اگر کام سوامی پریشان ہوتا، اگر اسے لگتا کہ اس کی ہتک ہوئی ہے یا کاروباری معاملے اسے الجھا دیتے ہیں تو سدھارتھ ہمیشہ اسے تضحیک کے ساتھ دیکھتا، مگر آہستہ آہستہ اور نامحسوس طور پر، گزرتے موسموں کے ساتھ تضحیک اور احساس برتری کم ہو گیا۔ اپنی بڑھتی ہوئی دولت کے ساتھ سدھارتھ نے آہستہ آہستہ عام لوگوں کے سے خصائص اختیار کر لئے، کچھ ان کی بچگانہ حرکتیں سیکھ لیں اور کچھ ان کی الجھنیں۔ پھر بھی وہ ان پر رشک کرتا، جتنا زیادہ وہ ان کا جیسا ہوتا جاتا اتنا ہی وہ اور رشک کرتا۔ وہ ایک چیز کی وجہ سے رشک کرتا جو ان کے پاس تھی اور وہ خود جس سے محروم تھا: اہمیت کا وہ احساس جس کے ساتھ وہ اپنی زندگیاں گزارتے، ان کے دکھ سکھ کی شدت اور عشق کرنے کی ان کی مستقل صلاحیتوں کی میٹھی چبھن۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے آپ سے محبت کرتے تھے، اپنے بچوں سے، عزت سے یا دولت سے، منصوبوں سے یا امید کے جذبے سے محبت کرتے تھے۔ مگر وہ ان سے یہ سب چیزیں نہ سیکھ سکا، یہ بچوں جیسی خوشیاں اور حماقتیں، اس نے ان سے صرف ناگوار چیزیں ہی سیکھیں، جن سے وہ خود نفرت کرتا تھا۔ اب اکثر یہ ہونے لگا کہ رنگین شاموں کے بعد وہ اگلی صبح اتنی دیر تک بستر میں لیٹا رہتا اور تھکن، کلفت محسوس کرتا۔ پھر کام سوامی اسے اپنی پریشانیاں سنا سنا کر اور بے زار کر دیتا تو وہ چڑ جاتا اور جھنجھلانے لگتا۔ جب وہ جوئے میں ہار جاتا تو کچھ زیادہ ہی زور سے ہنسنے لگتا۔ اس کا چہرہ اب بھی دوسروں سے زیادہ دانا اور زیرک تھا مگر آہستہ آہستہ اس کے چہرے پر بھی وہ تاثر پیدا ہو رہا تھا جو اکثر امیر لوگوں کے چہروں پر پایا جاتا ہے۔ بے اطمینانی کا تاثر، بیماری، بے لطفی، کاہلی، تنہائی کا تاثر، دھیرے دھیرے دولت کا روگ اس کی روح میں پھیلنے لگا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر9

بے زاری سدھارتھ کی آتما پر چڑھتی جارہی تھی، دھند کی طرح، نقاب کی طرح، آہستہ آہستہ، ہر روز تھوڑی سی اور گہری ہو جاتی، ہر ماہ تھوڑی سی اور گہری، ہر سال تھوڑی سی اور بھاری۔ جس طرح نیا لباس وقت کے ساتھ ساتھ پرانا ہو جاتا ہے، اس کے چمکیلے رنگ ماند پڑ جاتے ہیں، اس پر دھبے اور چرسیں پڑ جاتی ہیں، دامن تار تار ہو جاتا ہے اور یہاں وہاں سے کپڑا اچھی جاتا ہے، تاگے نچ جاتے ہیں، یہی سب سدھارتھ کی اس نئی زندگی کے ساتھ ہوا تھا جو گووند سے بچھڑنے کے بعد سے شروع ہوئی تھی، وہ اب پرانی ہو چکی تھی۔ اسی طرح وقت گزرنے کے ساتھ اس کا رنگ اور اس کی چمک دمک ماند پڑنے لگی: سلوٹیں اور دھبے پڑنے لگے، اور تہوں میں چھپے ہوئے شکست خواب اور گھن گھات لگائے بیٹھے تھے۔ سدھارتھ نے یہ نہیں دیکھا۔ اس نے بس یہ دیکھا کہ وہ مدھر اور صاف آواز جو ایک بار اس کے بھیتر جاگ پڑی تھی، اور اسکی بہترین گھڑیوں میں رونما ہو رہی تھی، وہ اب بالکل خاموش تھی۔

دنیا نے اسے جا پکڑا تھا۔ لذت اندوزی، لالچ، کاہلی اور آخر میں وہ برائی بھی جس سے اس نے ہمیشہ نفرت کی اور سب سے زیادہ احمقانہ سمجھا۔ لوبھ، جائیداد، ملکیت اور دولت نے بالآخر اسے گھیر لیا تھا۔ اب یہ کھیل کھلونے نہ رہے تھے، یہ اس کے لئے زنجیر اور بوجھ بن گئے تھے۔ سدھارتھ اس آخری اور بدترین نشیب کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر پانسے کی اچھال کے ساتھ بھٹکتا پھرتا، جس وقت سے اس نے من ہی من میں اپنی سادھنا چھوڑ دی تھی، تب سے سدھارتھ روپیہ اور زیور داؤ پر لگا کر جوا کھیلنے لگا تھا اور اس کا شوق بڑھتا جارہا تھا حالانکہ اس سے پہلے وہ اس کھیل میں اسے عام آدمیوں کا رواج سمجھتے ہوئے، مسکراتے ہوئے اور دوسروں کا دل رکھنے کے لئے حصہ لیا کرتا۔ اب وہ اچھا خاصا رعب دار کھلاڑی تھا، اس کے ساتھ کم لوگ کھیل پاتے کیوں کہ وہ بہت من چلے پن کے ساتھ اونچے داؤ لگاتا۔ وہ اس لئے کھیلتا تھا کہ یہ اس کی دلی ضرورت تھی۔ اسے اس بات میں بے انتہا شدید لذت حاصل ہوتی کہ اپنا منحوس روپیہ جوئے میں اڑا دے۔ کسی اور طریقے سے وہ اتنی صفائی اور تضحیک کے ساتھ نہیں دکھا سکتا تھا کہ وہ روپے کے لئے کتنی حقارت محسوس کرتا ہے، روپیہ جو بیوپاری کا جھوٹا خدا ہے۔ چنانچہ وہ بے دھڑک بڑے بڑے داؤ لگاتا، اپنے آپ سے نفرت کرتا جاتا، اپنی تضحیک کرتا جاتا۔ وہ ہزاروں جیت لیتا اور ہزاروں ہار بھی جاتا، روپیہ ہارتا، زیور ہارتا، اپنی ایک حویلی ہار گیا، پھر جیت گیا، پھر ہار گیا۔ اسے اس پریشانی سے لگاؤ ہو گیا تھا، وہ ہولناک اور موذی پریشانی جو جوئے کے دوران اسے ہوتی جب وہ اونچا داؤ لگاتا۔ اسے اس میں بہت مزہ آتا اور ہر بار اس کی تجدید کرنا چاہتا، اسے بڑھانا چاہتا، اسے جا بخشنا چاہتا کہ اس احساس ہی میں اسے ایک طرح کی خوشی ہوتی، ایک طرح کا اشتعال ملتا، اپنے پیٹ بھرے، دھبے، پھیلے، تھکے ماندے وجود کے دوران بڑھے چڑھے جیون کے یہی چند لمحے ملتے۔ اور اگر ہر گھاٹے کے بعد وہ پھر نئے دھن دولت کے حصول میں جٹ جاتا، بیوپار میں دلچسپی لیتا اور اپنے قرض داروں سے اصرار کرتا کہ جلد ادائیگی کریں کیوں کہ وہ پھر کھیلنا چاہتا ہے، وہ پھر دولت لٹانا چاہتا ہے، وہ پھر دولت کے لئے اپنی تحقیر ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ گھاٹا ہو جانے پر سدھارتھ بے صبرا ہو جاتا، دیر میں پیسے دینے پر قرض داروں سے جا الجھتا، اب وہ بھکاریوں سے رحمل کا برتاؤ نہ کرتا۔ اب اسے غریبوں کو قرضے اور تحفے دینے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ وہ جو پانسے کے ایک اچھال پر دس ہزار پھینک سکتا تھا اور پھینک کر ہنس سکتا تھا، وہ بیوپار میں سخت سے سخت اور تھڑدلا ہو گیا اور اکثر رات کو سوتے میں بھی دولت کے خواب دیکھنے لگا۔ اور جب بھی وہ اس نفرت زدہ دورے سے سنبھلتا، جب بھی وہ اپنی خواب گاہ کی دیوار پر نصب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا کہ بوڑھا اور بدصورت ہوتا جارہا ہے، جب بھی شرمندگی اور گھن اسے جا پکڑتی وہ پھر بھاگتا، پھر بھاگ کر اتفاقات کے اس کھیل میں جاتا، الجھ کر بھاگتا، شدت جذبات اور شراب کی طرف بھاگتا اور وہاں سے پھر واپس دولت حاصل کرنے کی اس دیوانی ریس کی طرف پلٹتا۔ اس بے مقصد سلسلے میں اس نے خود کو مٹا ڈالا، وہ بوڑھا اور بیمار ہو گیا۔

پھر ایک دفعہ ایک سپنے نے اسے یاد دلایا۔ شام کو وہ کملا کے ساتھ تھا، اس کے باغ میں۔ وہ پیڑ کے نیچے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کملا بہت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی، اور اس کے شبدوں کے پیچھے دکھ اور اکتاہٹ چھپی ہوئی تھی۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ گوتم کے بارے میں بتاؤ اور یہ ذکر سن کر اس کا جی نہیں بھرتا تھا اور وہ بار بار پوچھے جارہی تھی کہ اس کی آنکھیں کیسی روشن تھیں، اس کا چہرہ کتنا شانت تھا اور اس کے لب کتنے سندر تھے، اس کی مسکراہٹ کتنی مہربان تھی اور اس کا سارا انداز کتنا سنتوشی تھا۔ سدھارتھ بہت دیر تک اسے تتھاگت گوتم بدھ کے بارے میں بتاتا رہا اور کملا نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا: ''ایک دن شاید بہت جلد ہی میں بھی اس بدھ کی چیلی بن جاؤں گی۔ میں اپنا باغ اسے دے ڈالوں گی اور اس کی سکھشا میں آنند پاؤں گی۔'' پھر اس نے سدھارتھ کو پھسلا لیا اور محبت کے کھیل میں اسے والہانہ شوق کے ساتھ لپٹا لیا، شدت جذبات اور آنسوؤں کے ساتھ، جیسے وہ ایک بار پھر اس لذت گریزاں سے آخری قطرہ بھی نچوڑ لینا چاہتی ہو۔ اس سے پہلے سدھارتھ کو یہ عجیب سا احساس کبھی نہیں ہوا تھا

کہ شدت جذبات کا موت سے کتنا قریبی رشتہ ہے۔ پھر وہ اس کے پہلو میں لیٹ گیا اور اسکا چہرہ اپنے نزدیک کر لیا، اور پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں اس کے ہونٹوں میں افسردگی کا ایک شائبہ دیکھا۔ دلاویز خطوط اور جھریاں، وہ شائبہ جو پت جھڑ اور بڑھاپے کی یاد دلاتا تھا۔ خود سدھارتھ نے بھی، جواب چالیس کے پیٹے میں تھا، اپنے سیاہ بالوں میں جا بجا سفید بال دیکھے تھے۔ کملا کے سندر مکھڑے پر تھکن کی تحریر تھی، تھکن اس لمبے راستے پر چلتے رہنے کی جس پر کوئی خوشگوار منزل نہ تھی، تھکا ماندہ اور شروع ہوتا ہوا بڑھاپا اور وہیں چھپا ہوا خوف جو ابھی تک پوری طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا، اور شاید جس کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ جیون کے پت جھڑ کا خوف، بڑھاپے کا خوف،، موت کا خوف، ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے الوداع کہا اور وہاں سے چل دیا کہ اس کا دل پریشانی اور چھپے ہوئے خوف سے بھر آیا تھا۔

پھر سدھارتھ نے وہ رات اپنے گھر گزاری، کسبیوں اور مدرا کے سنگ، اور ایسا دکھاوا کیا جیسے وہ اپنے ساتھیوں سے برتر ہے جب کہ وہ ایسا نہ رہا تھا۔ اس نے بہت پی لی تھی اور آدھی رات کے بھی بعد جب دیر گئے وہ بستر پر لیٹا تو تھکا ماندہ تھا پھر بھی مضطرب اور نراش اور بس رو پڑنے کو تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس کے من میں اتنا دکھ بھر گیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ وہ اب سہ نہ پائے گا۔ اسے متلی ہو رہی تھی اور یہ کیفیت اس پر یوں طاری ہوئی جا رہی تھی جیسے کسیلا شربت یا ایسا سنگیت جو بہت پرشور اور سطحی ہو، رنڈیوں کی بناوٹی مسکراہٹ یا ان کے بالوں اور چھاتیوں کی بہت زیادہ میٹھی مہک، مگر سب سے زیادہ تو اس کا جی اپنے آپ سے متلا رہا تھا، اپنے بالوں سے، اپنے منہ کی شراب اور اس کی بو سے۔ اس شخص کی طرح جس نے بہت زیادہ کھا پی لیا ہو اور تکلیف کے مارے قے کرے اور پھر بہتر محسوس کرتا ہے، اسی طرح اس بے چین آدمی کو خواہش تھی کہ ایک زوردار ریلے کے ساتھ ان لذتوں سے، بے معنی زندگی کی ان عادتوں سے چھٹکارا پا جائے۔ پو پھٹے اپنے شہری مکان کے باہر صبح کی پہلی ہلچل کے وقت وہ اونگھ گیا اور نیم غنودگی کے چند لمحے حاصل کر سکا جو بس نیند کا ایک امکان تھے۔ اس دوران اس نے سپنا دیکھا۔

کملا کے پاس ایک چھوٹی سی نایاب چڑیا تھی جسے وہ ننھے سے سنہری پنجرے میں رکھتی تھی۔ اس چڑیا کے بارے میں اس نے سپنا دیکھا۔ یہ چڑیا جو صبح سویرے چہچہایا کرتی تھی، بالکل چپ ہو گئی اور سدھارتھ کو حیرت ہوئی اور وہ اس کے پاس گیا اور پنجرے کے اندر جھانکا۔ ننھی چڑیا مر چکی تھی اور پنجرے کے فرش پر اکڑی پڑی تھی۔ اس نے اسے باہر نکالا، ایک لمحے کے لئے اپنے ہاتھ میں تھاما، پھر دور سڑک پر اچھال دیا اور اسی پل وہ دہل کر رہ گیا اور اس کا جی یوں دکھا جیسے اس نے چڑیا کے ساتھ اپنے بہتیر کی ساری اچھی اور قیمتی چیزیں پھینک دی ہیں۔

وہ سپنے سے جاگا تو گمبھیر اداسی اس پر چھا گئی۔ اسے یوں لگا کہ اس نے زندگی بے کار اور بے مقصد گزار دی، اس کے پاس کوئی حیات آفرین چیز باقی نہ رہی تھی، ایسی چیز جو کسی طرح قیمتی یا قابل قدر ہوتی۔ وہ اکیلا کھڑا تھا، جیسے جہاز سے بچھڑا آدمی کنارے پر رہ گیا ہو۔

اداسی کے عالم میں سدھارتھ اس عیش باغ میں گیا جس کا وہ مالک تھا، دروازے بند کر دیئے، آم کے پیڑ تلے بیٹھ گیا اور اپنے دل میں دہشت اور موت محسوس کرنے لگا۔ وہ بیٹھ گیا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ مر رہا ہے، مرجھا رہا ہے، ختم ہو رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنے بکھرے ہوئے خیالات اکٹھے کیے، من میں اپنی ساری پچھلی زندگی کو دہرایا، بالکل شروع کے ان دنوں سے لے کر جو اسے یاد رہ سکے تھے۔ وہ واقعی خوش کب ہوا تھا؟ اسے خوشی کا احساس کب ہوا تھا؟ اچھا، ایسا تو اس نے کئی بار محسوس کیا تھا۔ یہ ذائقہ تو اس وقت بھی چکھا تھا جب لڑکپن میں برہمنوں کی شاباشی حاصل کی تھی، اور جب وہ اپنے سنگی ساتھیوں سے بہت آگے بڑھ گیا تھا، جب وہ مقدس اشلوک دہرانے میں خود اپنے آپ سے بھی بازی لے گیا تھا، علماء سے بحث مباحثے کے دوران اور بھینٹ میں مدد دیتے ہوئے بھی چکھا تھا۔ تب اسے من میں یہ محسوس ہوا تھا: ''ایک راستہ تمہارے سامنے ہے اور تمہیں اس پر چلنے کا بلاوا دیا جا رہا ہے، دیوتا تمہارے منتظر ہیں۔'' اور پھر ایک نوجوان کی حیثیت سے جب مسلسل مائل بہ پرواز منزل نے اسے اپنے جیسے تلاش کرنے والوں کی بھیڑ سے باہر کھینچ لیا، جب اس نے برہمنوں سے سبق سیکھنے کے لئے بہت محنت کی تھی، جب ہر تازہ حاصل کردہ علم ایک نئی پیاس کا پیش خیمہ بنتا، اور پھر دوبارہ اس پیاس کے بیچ، اپنی محنت کے درمیان، اس نے سوچا تھا: چلے چلو، چلے چلو، یہی ہے تمہارا راستہ۔ یہی آواز اس نے اس وقت سنی تھی جب وہ اپنا گھر چھوڑ کر سادھوؤں کی زندگی اختیار کر رہا تھا، اور دوبارہ سنی جب وہ سادھوؤں کو چھوڑ کر اس مرد کامل کے پاس جا رہا تھا، اور پھر سنی جب وہ کسی نامعلوم شے کی خاطر اس مرد کامل کو بھی چھوڑ کر چل دیا تھا۔ کتنا عرصہ ہو گیا جو یہ آواز سنی تھی، کتنا عرصہ ہو گیا کہ وہ نئی بلندیوں کی طرف پرواز نہ کر سکا تھا! کس قدر سطحی اور اجاڑ رہا تھا اس کا راستہ بھی! کتنے طویل برس جو اس نے کسی وشال آورش کے بنا کاٹ ڈالے تھے، بنا کسی پیاس کے، بنا کسی بلندی کے، چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر قانع رہ کر، مگر پوری طرح خوش پھر بھی نہیں! یہ جانے بغیر، اس نے ان سارے برسوں میں کوشش

کی تھی اور تمنا کی تھی کہ وہ ان عام آدمیوں جیسا ہو جائے، ان بالکوں جیسا، اور پھر بھی اس کی زندگی ان کے مقابلے میں آفت زدہ اور مفلس رہی تھی کہ ان کے مقاصد اس کے مقاصد نہ تھے، ان کے غم اس کے تھے۔ کام سوامی جیسے لوگوں کی یہ ساری دنیا اس کے واسطے کھیل تھی، ایک ناچ تھی، ناٹک تھی آدمی جس کا تماشا دیکھتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ صرف کملا اسے عزیز تھی۔۔۔۔ اس کے لئے قابل قدر تھی۔ مگر کیا اب بھی رہی تھی؟ کیا اب بھی اسے کملا کی ضرورت تھی؟۔۔۔۔ اور کملا کو اس کی؟ کہیں وہ ایسا کھیل تو نہیں کھیل رہے تھے جس کا کوئی انت نہ ہو؟ کیا اس کھیل کے لئے زندہ رہنا ضروری تھا؟ نہیں۔ اس کھیل کا نام تھا سنسار۔ بچوں کا کھیل، ایسا کھیل جو بہت دلچسپ تھا اگر ایک دفعہ کھیلا جائے، دو دفعہ، دس دفعہ۔۔۔ مگر کیا اس لائق تھا کہ مستقل کھیلا جاتا رہے؟

پھر سدھارتھ نے جانا کہ کھیل ختم ہو چکا ہے، اب وہ اسے مزید نہیں کھیل سکتا۔ اس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی، اسے یوں لگا جیسے کوئی چیز مر گئی۔

وہ دن بھر آم کے پیڑ تلے بیٹھا سوچا کیا، اپنے باپ کے بارے میں، گووند کے بارے میں، گوتم کے بارے میں۔ کیا اس نے ان سب کو اس لئے چھوڑا تھا کہ وہ کام سوامی بن جائے؟ وہ وہاں رات ڈھلے تک بیٹھا رہا۔ جب اس نے نظر اٹھائی اور تارے دیکھے اور سوچا: میں یہاں آم تلے بیٹھا ہوں اور اپنے عیش باغ میں۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ کیا یہ ضروری تھا، ٹھیک تھا، کیا یہ نادانی تھی کہ وہ آم کے پیڑ کا اور باغ کا مالک ہو؟

وہ ان سب سے بھر پایا۔ یہ سب اس کے بھیتر مر گیا۔ وہ اٹھا اور آم کو اور عیش باغ کو الوداع کہا۔ اس نے سارے دن کچھ نہ کھایا تھا تو اسے بہت بھوک لگ رہی تھی، اور شہر میں اپنے مکان کا خیال، اپنے کمرے اور کمرے میں لگے بستر کا اور کھانوں سے چنے دسترخوان کا خیال آ رہا تھا۔۔۔ وہ بے دلی سے مسکرایا اور ان سب چیزوں کو الوداع کہا۔

اس رات سدھارتھ نے اپنے باغ اور شہر کو چھوڑ دیا اور کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ بہت عرصے تک کام سوامی نے اس خیال سے کہ کہیں وہ ڈاکوؤں کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو، اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ کملا نے اسے نہیں ڈھونڈا۔ جب اسے پتہ چلا کہ سدھارتھ غائب ہو گیا ہے تو اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ اسے کیا پہلے دن سے اس کی توقع نہ تھی؟ کیا وہ سادھو نہ تھا، بے گھر اور یاتری نہ تھا؟ یہ چیز اسے خاص طور پر پچھلی ملاقات میں محسوس ہوئی تھی، اور اپنے نقصان کے اس دکھ کے بیچوں بیچ وہ خوش ہونے لگی کہ اس آخری موقعے پر اس نے سدھارتھ کو اپنی چھاتی سے لپٹا کر یوں بھینچا تھا کہ خود کو اس کی ملکیت اور اس کی مغلوبہ پایا تھا۔

جب اس نے سدھارتھ کے غائب ہو جانے کی خبر سنی تو وہ کھڑکی میں آئی جہاں وہ ایک نایاب چڑیا کو سونے کے پنجرے میں رکھتی تھی۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا، چڑیا کو باہر نکالا اور اڑا دیا۔ بہت دیر تک وہ غائب ہوتی ہوئی چڑیا کو دیکھتی رہی۔ اس دن سے کملا نے لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا اور گھر بند کروا دیا۔ کچھ عرصے بعد اسے پتہ چلا کہ سدھارتھ سے پچھلے ملاپ سے وہ حاملہ ہو گئی ہے۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر10

دریا کنارے

سدھارتھ شہر سے دور بھٹکتا پھرا، اور وہ بس ایک ہی بات جانتا تھا کہ وہ واپس نہیں جا سکتا کہ وہ اتنے برسوں سے جس طرح زندگی بسر کر رہا تھا اس زندگی کو متلی کی حد تک چکھ کر دیکھ لیا تھا۔ وہ چہچہاتی چڑیا مر چکی تھی، اس کی موت، جسے اس نے سپنے میں دیکھا تھا، وہ اس کے اپنے من کی چڑیا تھی۔ وہ سنسار میں بڑی طرح الجھ کر رہ گیا تھا، اس نے اپنے واسطے چہار جانب سے متلی اور موت جمع کر لی تھی، جیسے وہ اسفنج جو ہر طرف سے پانی جذب کر لیتا ہے، یہاں تک کہ پانی سے بھر جاتا ہے۔ اس میں بے زاری بھر گئی تھی، اس میں مصیبت بھر گئی تھی، موت بھر گئی تھی، اب دنیا میں کوئی چیز باقی نہیں بچی تھی جو اسے اپنی جانب راغب کر سکے، جس سے اسے آنند مل سکے۔

اسے شدت کے ساتھ نیستی کی تمنا تھی کہ وہ سکون پا سکے، مر جائے، مٹ جائے، کاش اس پر بجلی گر پڑے! کوئی شیر نکل آئے اور اسے پھاڑ کھائے، کوئی مدھرا، کوئی وش ہو جو اسے ایسی مدہوشی، ایسی غفلت دے دے، جو اسے سب کچھ بھلا دے، جو اسے ایسی نیند سلا دے کہ وہ پھر نہ اٹھے، کوئی غلاظت ایسی بچی تھی جو اس نے اپنے آپ نہ مل لی ہو، کوئی پاپ، کوئی مورکھتا ایسی تھی جو اس نے نہ کی ہو، اس کی آتما پر لگے دھبو میں سے ایسا کوئی دھبہ جس کا ذمہ دار خود وہ ہی نہ ہو؟ اب بھی کیا یہ ممکن رہا تھا کہ وہ زندہ رہے اب بھی ممکن تھا کہ بار بار سانس لئے جائے، اور بھوک محسوس کرے اور کھانا کھائے، پھر سے سوئے، پھر سے عورتوں کے سنگ سوئے، کیا یہ سب چکر اس کے لئے ختم نہ ہو چکے تھے، تھک کر بے جان نہیں ہو چکے تھے؟

سدھارتھ جنگل میں بہتے دریا پر پہنچا۔ یہ وہی دریا تھا جس کے پار اسے ایک دفعہ ایک مانجھی لے گیا تھا جب وہ نوجوان تھا اور گوتم کے شہر سے آیا تھا۔ وہ دریا پر پہنچ کر رک گیا اور اس کے کنارے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ تھکن اور بھوک نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ وہ آگے کیوں جائے، کہاں اور کس کارن؟ اب کوئی مقصد نہ تھا۔ اب کچھ بھی نہیں رہا تھا، سوائے اس سارے بکھرے سپنے سے پیچھا چھڑانے کی گہری اور دکھ بھری تمنا کے، اس باسی شراب کو تھوک دینے اور اس تلخ، دکھ بھری زندگی کا خاتمہ کر دینے کے سوائے کچھ نہیں۔

دریا کنارے ایک پیڑ تھا، ناریل کا پیڑ۔ سدھارتھ نے اس سے ٹیک لگا لی، اپنی بانہیں اس کے تنے کے گرد ڈال دیں اور نیچے بہتے سبز پانی میں جھانکنے لگا۔ اس نے نیچے دیکھا اور اس کے من میں یہ خواہش چھا گئی کہ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ دے اور اپنے آپ کو اس پانی میں غرق ہو جانے دے۔ پانی کے اندر ایک یخ بستہ خلاء اس کی آتما کے سونے پن کی عکاسی کر رہا تھا۔ ہاں، وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو مٹا ڈالے، فنا کر ڈالے، اپنی زندگی کا ناکارہ ڈھانچہ تباہ کر ڈالے، دیوتاؤں کے اس بھیانک مذاق کو پھینک دے۔ یہی تو وہ کام تھا جس کے کرنے کی تمنا اس کے دل میں تھی، کہ جس روپ سے اسے نفرت ہو گئی تھی اسے غارت کر ڈالے! مچھلیاں کھا جائیں اسے، اس کتے سدھارتھ کو، اس پاگل کو، اس بگڑے گلے سڑے بدن کو، اس تباہ حال، سست آتما کو! مچھلیاں اور مگرمچھ کھا جائیں اسے، راکھشش بوٹی بوٹی کر ڈالیں اس کی!

اپنے مسخ چہرے سے اس نے پانی میں جھانکا۔ اس نے اپنے چہرے کا عکس دیکھا اور اس پر تھوک دیا۔ اس نے پیڑ کے تنے سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا اور ذرا سا ترچھا ہوا کہ وہ سیدھا پانی میں گر جائے اور ڈوب کر تہہ سے جا لگے۔ آنکھیں بند کئے وہ جھکا۔ موت کی جانب۔

پھر اپنی آتما کے کسی بھولے بسرے کونے سے، اپنی تھکی ماندی زندگی کی یاد سے، اس نے ایک آواز سنی۔ ایک شبد تھا، ایک ماترا تھی، جسے سوچے سمجھے بغیر اس نے دھیرے سے ادا کیا، وہ تمام قدیمی برہمن پرارتھناؤں کا آغاز واختتام، وہ پوتر شبد ''اوم'' جس کے معنی تھے ''ذات کامل'' یا ''تکمیل۔'' اسی لمحے جب اوم کی آواز سدھارتھ کے کانوں میں پڑی تو اس کی نیند کی ماتی آتما اچانک جاگ اٹھی اور اس نے اپنی اس حرکت کی حماقت کو سمجھ لیا۔

سدھارتھ بے حد دہشت زدہ ہو گیا۔ تو وہ ان حالوں کو پہنچ چکا تھا، وہ اتنا کھو گیا تھا، اتنا پریشان تھا، عقل وفراست سے اس قدر عاری ہو گیا تھا کہ اس نے موت کی خواہش کی تھی۔ یہ خواہش، یہ بچکانہ خواہش اس کے اندر اتنی طاقت پکڑ چکی تھی: وہ اپنے جسم کو فنا کر کے شانتی پانا چاہتا تھا۔ پچھلے دنوں کا تمام کرب، وہ شکست خواب، ساری نراشا، ان سب نے بھی اس طرح دبلا نہیں ڈالا تھا جیسے وہ لمحہ جب اوم کا شبد اس کے شعور میں اترا اور اس نے اپنی گراوٹ اور اپنے جرم کو پہچانا۔

اس نے من ہی من میں ''اوم'' دہرایا اور اسے برہما کا زندگی کے لافانی ہونے کا احساس ہوا۔ اسے وہ سب یاد آیا جو وہ بھول چکا تھا، جو الوہی تھا۔

مگر یہی بس ایک پل کے لئے تھا، بس ایک جھلک، سدھارتھ تھک ہار کر ناریل کے پیڑ کے پاس گر پڑا۔ اوم کا شبد دہراتے دہراتے اس نے اپنا سر پیڑ کی جڑوں سے ٹکا دیا اور گہری نیند میں کھو گیا۔

اس کی نیند گہری تھی اور خوابوں سے خالی تھی، مدتوں سے وہ اس طرح سے نہیں سویا تھا۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب وہ جاگا تو اسے لگا کہ دس برس بیت گئے ہیں۔ اس نے پانی کی نرم آہٹ سنی! اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور اسے یہاں کون لے کر آیا ہے۔ اس نے اوپر دیکھا اور درختوں کو اور آکاش کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ کہاں تھا اور وہاں کس طرح آیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بہت دیر تک یہاں رہے۔ اسے یوں لگا کہ ماضی پر ایک مہین پردہ پڑ گیا ہے، وہ سب سے بہت دور چلا گیا ہے اور غیر اہم ہو گیا ہے۔ اسے بس اتنا پتہ تھا کہ اس کی پچھلی زندگی (اپنی جگار کے اس اولین لمحے میں پچھلی زندگی ایسے یوں لگی جیسے کوئی پچھلا جنم ہو، موجودہ ذات کی کوئی پرانی دھرانی پچھلی زندگی) ختم ہو چکی ہے، اور وہ اس قدر متلی زدہ اور ذلیل تھی کہ وہ اسے ختم کر دینا چاہتا تھا، مگر اسے ہوش آیا دریا کنارے، ناریل کے پیڑ تلے اور اس کے ہونٹوں پر شبدوں کا شبد ''اوم'' تھا۔ پھر وہ سو گیا تھا اور جاگا تو دنیا کو یوں دیکھتا تھا جیسے کوئی نیا آدمی۔ دھیرے دھیرے اس نے دہرایا ''اوم'' جسے کہتے کہتے وہ سو گیا تھا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کی ساری نیند ''اوم'' کے اس شبد کا گہرا اوردان تھا، اوم ہی کی سوچ تھا، وہ اس میں ڈوب گیا تھا اور اندر تک اتر گیا تھا اوم میں، اس میں جو بے نام ہے، جو الوہی ہے۔

کتنی پھل تھی یہ نیند بھی! آج تک کسی نیند نے اسے اتنا تازہ دم نہیں کر دیا تھا، اتنا چاق و چوبند، جوان تر اور بالکل نیا! شاید وہ واقعی مر گیا تھا، شاید وہ ڈوب گیا تھا اور اب نئے روپ میں دوبارہ پیدا ہوا تھا۔ نہیں، وہ اپنے آپ کو پہچانتا تھا، اپنے ہاتھ پیروں کو پہچانتا تھا، جہاں وہ لیٹا تھا اس جگہ کو پہچانتا تھا اور اس ذات کو بھی جو اس کے سینے میں چھپی تھی جو سدھارتھ، انفرادیت پسند، اپنی مرضی کے مالک سدھارتھ کی ذات تھی۔ مگر یہ سدھارتھ کچھ بدل گیا تھا، کچھ نیا ہو گیا تھا۔ وہ بہت آنند سے سویا۔ اب وہ پوری طرح جاگا ہوا تھا، خوش وخرم اور چونچال تھا۔

سدھارتھ اٹھا اور دیکھا کہ ایک سادھو گیروا جوڑا پہنے، سر منڈا ہوا، اس کے سامنے دھیان رچائے بیٹھا ہے۔ سدھارتھ نے اس کو دیکھا، اس کے سر پر نہ تو بال تھے نہ داڑھی مونچھیں تھیں، اور اسے دیکھتے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ سدھارتھ نے اس سادھو میں اپنے بچپن کے دوست گووند کو پہچان لیا وہی گووند جس نے تتھاگت بدھ میں پناہ ڈھونڈی تھی۔ گووند کی عمر بھی ڈھل رہی تھی، مگر اس کے چہرے پر وہی تجسس وفا، شوق، بے چینی تھی۔ مگر جب گووند نے اس کی نظریں اپنی جانب پا کر آنکھ اٹھائی تو سدھارتھ نے جان لیا کہ گووند نے اسے نہیں پہنچانا۔ اسے جاگتا دیکھ کر گووند خوش ہوا۔ یقیناً وہ وہاں بہت دیر سے بیٹھا ہوا اس کے جاگنے کا منتظر تھا حالاں کہ وہ اسے نہیں پہچانتا تھا۔

''میں سو رہا تھا۔'' سدھارتھ بولا۔ ''تم یہاں کیسے آئے؟''

''تم سو رہے تھے۔'' گووند نے جواب دیا۔ ''اور ایسی جگہوں پر سونا نہیں اچھا جدھر جنگل کے جانور اور سانپ پھرتے ہیں۔ میں تتھاگت بدھ کے چیلوں میں سے ہوں، بدھ جو شاکیہ منی ہے اور میں اپنے ساتھیوں کے سنگ یاترا کو نکلا ہوں۔ میں نے تمہیں خطرے کی جگہ پر سوتا دیکھا تو تمہیں جگانے لگا، پھر میں نے دیکھا کہ تم بہت گہری نیند سوئے ہوئے ہو تو میں اپنے بھائیوں سے پیچھے رہ گیا اور تمہارے پاس بیٹھ گیا۔ مگر لگتا ہے کہ میں جو تمہاری نگہبانی کرنا چاہتا تھا خود سو گیا اور میں نے ٹھیک نگہبانی نہیں کی۔ مگر اب تو تم جاگ گئے ہو، اس لئے اب میں جاؤں گا اور اپنے بھائیوں سے مل جاؤں گا۔''

''دھنیہ ہو سنیاسی، تم نے میری نیند کی حفاظت کی۔ تتھاگت کے چیلے بہت نیک ہیں، مگر اب تم اپنی راہ لگو۔''

''تو میں چلا۔ خوش رہو۔''

''دھنیہ با دسنیاسی۔''

گووند جھکا اور کہنے لگا ''رخصت''

''رخصت گووند۔'' سدھارتھ نے کہا۔

سدھارتھ ٹھہر گیا۔

''معاف کیجئے۔ آپ کو میرا نام کیسے پتہ چلا؟''

اس پر سدھارتھ ہنسا۔

''گووند میں تمہیں اپنے باپ کے گھر سے جانتا ہوں اور برہمنوں کے مدرسے سے اور مقدس چڑھاووں سے اور سادھوؤں کے ساتھ قیام سے اور اس لمحے سے جب جٹھاون کے کنج میں تم نے تتھاگت سے وفاداری کا عہد کیا تھا۔''

''تم سدھارتھ ہو۔'' گووند پکار اٹھا۔ ''اب میں نے تمہیں پہچان لیا ہے، اور پتہ نہیں تم کو فوراً کیوں نہ پہچان لیا۔ پرنام ہو، سدھارتھ، تمہیں دوبارہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔''

''میں بھی تمہیں دیکھ کر خوش ہوں۔ تم نے نیند کے وقت میری حفاظت کی۔ میں پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں حالاں

کہ مجھے محافظ کی ضرورت نہیں تھی۔تم کہاں جا رہے ہو،میرے دوست؟''

''میں کہیں نہیں جا رہا۔ہم سادھولوگ ہمیشہ چلتے رہتے ہیں،سوائے برسات کے۔ہم ہمیشہ ایک جگہ سے دوسری جگہ چلتے رہتے ہیں۔اصولوں کے مطابق رہتے ہیں،دھرم سکھاتے ہیں، بھیک مانگتے ہیں اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ہم ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔مگرتم کہاں جا رہے ہو،سدھارتھ؟''

سدھارتھ نے کہا:''میرے ساتھ بھی وہی ہے جوتمہارے ساتھ ہے،دوست۔میں کہیں نہیں جا رہا۔میں صرف راستے پرہوں۔میں یاترا کررہا ہوں۔''

گووند نے کہا:''تم کہتے ہو کہ تم یاتراپر ہو۔میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔مگر معاف کرنا،سدھارتھ،تم یاتری تو نہیں لگتے۔تم نے دھونت لوگوں کے سے کپڑے پہن رکھے ہیں،تم نے مہنگے جوتے پہنے ہوئے ہیں اورتمہارے سگھندت بال یاتریوں کے سے نہیں ہیں،سنیاسیوں کے سے بال نہیں ہیں۔''

''تم نے ٹھیک دیکھا،دوست۔تم اپنی تیز آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتے ہو۔مگر میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ میں سنیاسی ہوں۔میں نے یہ کہا کہ میں یاترا کررہا ہوں اور یہ سچ ہے۔''

''تم یاترا کررہے ہو۔'' گووند نے کہا''مگر کم لوگ ہوں گے جوایسے کپڑوں میں یاترا پر نکلیں،ایسے کپڑوں میں، ایسے جوتوں میں،ایسے بالوں کے ساتھ۔میں جو اتنے برسوں سے پھر رہا ہوں میں نے تو ایسا یاتری کبھی نہیں دیکھا۔''

''میں تمہاری بات مانتا ہوں،گووند۔مگرآج تم نے ایسے کپڑوں اورایسے جوتوں میں ایک یاتری کو دیکھ لیا ہے۔یاد رکھنا،اے میرے دوست،کہ ہمارے کپڑوں اور بالوں کی تراش خراش بہت پائیداراور عارضی ہے۔خود ہمارے بال اور ہمارے بدن بھی عارضی ہیں۔تم نے ٹھیک دیکھا۔میں دھنوانوں کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔میں یہ کپڑے اس لئے پہنے ہوئے ہوں کہ میں آپ دھنوان رہا ہوں،اورمیں دنیاداروں کے سے بال اس لئے بنائے ہوئے ہوں کہ میں بھی ان میں سے رہا ہوں۔''

©۔جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

سدھارتھ
ہرمن ہیسے
مترجم: آصف فرخی

قسط نمبر11

''اوراب تم کیا ہو، سدھارتھ؟''

''مجھے نہیں معلوم، میں اتنا کم جانتا ہوں جتنا کہ تم ۔ میں راستے پر ہوں ۔کل میں دھن دولت والا تھا، آج نہیں ہوں ۔اور کل کیا ہوں گا یہ مجھے نہیں معلوم ۔''

''کیا تمہارا دھن کھوگیا ہے؟''

''میں نے اسے کھو دیا ہے یا اس نے مجھے ۔یہ نہیں پتہ ۔دنیا کا چکر جلدی جلدی گھوم جاتا ہے، دوست کہاں گیا وہ سدھارتھ جو برہمن تھا، وہ سدھارتھ جو سنیاسی تھا، وہ سدھارتھ جو دھنوان تھا، جو عارضی ہے وہ جلدی بدل جاتا ہے، گووند ۔یہ تمہیں معلوم ہے ۔''

بہت دیر تلک گووند اپنے بچپن کے دوست کو شک بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے سامنے جھکا، جس طرح کسی صاحب حیثیت کے سامنے جھکا جاتا ہے، پھر اپنی راہ چل پڑا۔

مسکراتے ہوئے سدھارتھ اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے اب بھی اپنے اس وفادار، پریشان حال دوست سے محبت تھی ۔اور اس پل، اس شان دار گھڑی، اپنی نہایت عمدہ نیند کے بعد اوراوم سے بھرپور ہو کر وہ کسی چیز اور کسی شخص سے محبت کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا ۔یہی تو وہ جادو تھا جو اس نیند کے دوران اس پر اور اس کے بھیتر اوم کے شبد پر چل گیا تھا۔ اسے ہر چیز سے محبت تھی، وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا اس کے لئے مسرت انگیز محبت سے بھر گیا تھا۔ اور اسے یوں لگا کہ پہلے اسی وجہ سے تو وہ بیمار تھا۔ اس لئے کہ وہ کسی بھی چیز اور کسی بھی شخص سے محبت نہیں کر سکتا تھا ۔

چہرے پر مسکراہٹ لئے، سدھارتھ جاتے ہوئے بھکشو کو دیکھتا رہا۔ نیند نے اس کو توانا بنا دیا تھا، مگر اسے بہت بھوک لگ رہی تھی کہ اس نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا، اور وہ وقت مدتوں پہلے گزر چکا تھا کہ جب وہ بھوک سے لڑ سکتا تھا۔ دکھ کے ساتھ، اور ہنستے ہوئے بھی، اس نے اس سمے کو یاد کیا۔ اسے یاد تھا کہ تب اس نے کملا کے سامنے تین چیزوں کی ڈینگ ماری تھی، تین اعلیٰ اور ناقابل شکست چیزیں: برت رکھنا، انتظار کرنا اور سوچنا۔ یہی چیزیں اس کی ملکیت تھیں، اس کی قوت تھیں اور اس کی طاقت، اس کے ہاتھ میں مضبوط عصا تھیں ۔اپنی نوجوانی کے پرعزم اور سر گرم برسوں میں اس نے یہی تین فن حاصل کئے تھے، اور ان کے سوا کچھ نہیں ۔اب وہ انہیں کھو چکا تھا، اب اس کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہیں تھی، نہ فاقہ نہ فکر۔ اس نے ان کو بہت گھٹیا چیزوں کے عوض بدل لیا تھا۔ عارضی چیزوں سے، مایا میوہ سے، آسائشوں کی زندگی سے اور دولت سے بدل لیا تھا۔ وہ ایک عجیب راستے پر چل پڑا تھا۔ اوراب اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک معمولی آدمی بن چکا ہے ۔

سدھارتھ اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ اسے سوچنا بھی کٹھن معلوم ہوا۔ اس کے اندر سوچنے کی کوئی خواہش باقی نہ رہی تھی، مگر اس نے اپنے آپ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

اس نے سوچا اب یہ ساری عارضی چیزیں مجھ سے پھر دور چلی گئی ہیں اور اب میں پھر سورج کے نیچے یوں کھڑا ہوں جیسے اپنے بچپن میں کھڑا ہوا تھا۔ کوئی چیز بری نہیں ہے، میں کچھ نہیں جانتا، میں کسی چیز کا مالک نہیں، میں نے کچھ نہیں سیکھا۔ کتنی عجیب بات ہے یہ! اب جو میں نوجوان نہیں، جب میرے بال سفید ہو چلے ہیں، جب میرا کس بل گھٹنے لگا ہے تو میں بچے کی طرح پھر سے سیکھنا شروع کرر ہا ہوں ۔اسے ہنسی آ گئی ۔ہاں اس کی تقدیر بھی عجیب تھی! وہ پیچھے کی طرف لوٹ رہا تھا، اور پھر سے دنیا کے سامنے کھڑا ہوا تھا، خالی ہاتھ، ننگا بچہ اور ان پڑھ ۔مگر اسے اس بات پر کوئی دکھ نہ تھا، نہیں، بلکہ اسے تو ہنسی آ رہی تھی، اپنے آپ پر ہنسی، اس مورکھ دنیا پر ہنسی!

تمہاری چیزیں پیچھے کی طرف پلٹ رہی ہیں، اس نے اپنے آپ سے کہا اور ہنس پڑا اور جب وہ یہ کہہ رہا تھا تو اس کی نظر دریا پر پڑی اور اس نے دیکھا کہ دریا بھی مستقل الٹا بہہ رہا ہے اور گنگناتا جا رہا ہے ۔یہ دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوا، وہ خوش ہو کر دریا پر مسکرانے لگا، کیا یہی وہ دریا نہیں تھا جس میں ایک مرتبہ وہ ڈوب رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ہزاروں سال پہلے ۔ ۔ ۔ ۔یا اس کا سپنا دیکھا تھا؟

اس کی زندگی بھی کس قدر عجیب تھی، اس نے سوچا۔ وہ عجیب راہوں پر چلا تھا ۔لڑکپن میں میں دیوتاؤں اور چڑھاووں میں الجھا رہا، اور جوانی میں تپیا، سوچ وچار اور گیان دھیان میں پڑ گیا ۔میں برہما کی کھوج میں تھا اور آتما میں چھپے ابد کا احترام کرتا تھا۔ جوان ہو کر میں کفارے کی طرف راغب ہوا۔ میں جنگلوں میں رہا، گرم وسرد سہتا رہا۔ میں نے برت رکھنا سیکھا، میں نے جسم پر فتح پانا سیکھا۔ پھر میں نے ایک عالم حیرت میں وشال بدھ کی سکھشا سنی ۔مجھے معلوم ہوا جیسے ساری ودیا اور دنیا کی یکتائی میرے اندر لہو سان گھوم رہی ہے، مگر مجھ پر لازم تھا کہ میں بدھ کو اور اس مہان ودیا کو بھی چھوڑ دوں ۔میں چلا گیا اور میں کملا سے کام رس، کام سوامی سے بیوپار سیکھا۔ میں نے دولت جمع کی، میں نے دولت لٹائی ۔مجھے عمدہ کھانوں کا چسکا پڑ گیا، میں نے اپنے حواس میں تحریک پیدا کرنا

سیکھی۔ مجھے اس طرح نہ جانے کتنے برس گزارنے پڑے محض اپنی ذہانت کو تباہ کرنے، سوچنے کی قوت کو غارت کرنے اور وحدت اشیاء کو فراموش کر دینے کے لئے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ آہستہ آہستہ اور کئی دفعہ کے انحراف کے بعد میں مرد سے پھر بچہ بن گیا، سوچنے والے آدمی سے پھر معمولی آدمی بن گیا؟ مگر پھر بھی یہ راستہ اچھا تھا اور میری چھاتی کی چڑیا نہیں مری۔ اور کیا راستہ رہا ہے یہ بھی! مجھے کس قدر تجربات حاصل ہوئے، کتنی مورکھتا، کتنے پاپ، کتنی غلطیاں، کس قدر متلی، دکھ، چھل کپٹ اور بس صرف اس لئے کہ میں پھر سے بچہ بن جاؤں اور از سر نو شروع کروں۔ مجھے نراشا ملی، مجھے من کی سب سے نچلی پاتال تک گرنا پڑا۔ آتم ہتیا کے بارے میں سوچنا پڑا کہ پھر سے برکت حاصل ہو۔ میں پھر سے اوم کا شبد سنوں، پھر سے چین کی نیند سو سکوں اور تازہ دم ہو کر اٹھوں۔ مجھے پھر سے مورکھ بننا پڑا تا کہ اپنی آتما کو پا سکوں۔ دوبارہ جینے کے لئے پھر سے پاپی بننا پڑا۔ اب میرا راستہ مجھے کدھر لے جائے گا؟ یہ راستہ بھی مورکھ ہے، یہ بل کھاتا ہے، دائروں میں گھومتا ہے مگر یہ جدھر جائے گا میں اس پر چلوں گا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے اندر خوشی کا جذبہ امنڈ رہا ہے۔

یہ کہاں سے آتا ہے، اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ خوشی کے اس جذبے کا سبب کیا ہے؟ کیا یہ اس لمبی، گہری نیند سے ابھرا ہے جس نے مجھے تازہ دم کر دیا؟ یا اوم کے اس شبد سے جس کا میں نے ورد کیا؟ یا اس وجہ سے کہ میں بھاگ لیا، اس لئے کہ میرا فرار مکمل ہو چکا ہے، اس لئے کہ میں پھر سے آزاد ہوں، آکاش تلے بالک کی طرح کھڑا ہوں۔ ارے، یہ فرار بھی کتنا اچھا رہا اور یہ آزادی! جس جگہ سے میں بھاگ کر آیا ہوں وہاں سارے وقت فضا میں تیل مصالحے اور تساہل بسے رہتے تھے۔ کس قدر نفرت تھی مجھے دولت کے اس سنسار سے، اس بدمستی اور کھیل سے! مجھے اپنے آپ سے کتنی نفرت ہو گئی تھی، کتنا گھونٹا، دبایا، زہر دیا تھا اپنے آپ کو، خود کو بوڑھا اور بدصورت بنا لیا تھا۔ اب میں کبھی پہلے کی طرح نہیں سوچوں گا کہ سدھارتھ چالاک ہے۔ مگر ایک کام اچھا کیا ہے، جس سے میں خود خوش ہوا ہوں، جس کی میں تعریف کروں گا۔ میں نے اپنے آپ سے اس نفرت کا خاتمہ کر دیا ہے، اس احمقانہ کھوکھلی زندگی کو ختم کر دیا ہے۔ میں تمہاری تعریف کرتا ہوں، سدھارتھ، کہ نادانی کے اتنے برسوں بعد بھی تمہیں یہ خوب سوجھی اور تم نے یہ کام تو کیا، تم نے اپنے ہردے میں چڑیا کو گاتے سنا اور تم نے اس کی بات مانی۔

تو اس طرح اس نے اپنی تعریف کی اور آپ سے خوش ہوا اور متعجب ہو کر اپنے پیٹ کی صدا سنی کہ بھوک سے غراتا تھا۔ اسے لگا کہ اس نے جی بھر کے اپنے دکھوں کا ایک گھونٹ پیا اور تھوک دیا، اپنی مصیبت کے گھونٹ بھرے اور ان کو نراش اور موت تک جھیلا۔ مگر اب تو سب ٹھیک تھا، وہ کام سوامی کے سنگ اور بہت رہ سکتا تھا، پیسہ بنا سکتا تھا اور لٹا سکتا تھا، پیٹ بھر کے آتما کو بھول سکتا تھا، وہ اور بہت دنوں تک اس نرم، آرام دہ خوب سجے سنورے نرک میں رہ سکتا تھا، اگر یہ لمحہ اسے حاصل نہ ہوا ہوتا، انتہائی مایوسی اور یاس کا وہ لمحہ وہ مضطرب لمحہ جب وہ بہتے پانی پر جھک گیا تھا اور آتم ہتیا پر تل گیا تھا۔ اور اس نراش، اس گھناؤنی متلی نے بھی اس پر پوری طرح غلبہ نہیں پا لیا تھا۔ یہ چڑیا، یہ ٹھنڈا نرمل چشمہ اور یہ صاف آواز اس کے بھیتر ابھی زندہ تھی۔۔۔ اسی کارن تو وہ خوشی مناتا تھا، اسی کارن تو وہ ہنستا تھا، اسی کارن تو سفید بالوں میں بھی اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

یہ اچھا ہے کہ آدمی ہر چیز کا تجربہ خود حاصل کر لے، اس نے سوچا۔ بچپن میں میں نے سیکھا تھا کہ دنیا کی لذتیں اور دولت اچھی نہیں ہوتیں۔ مجھے یہ بات بہت پہلے سے معلوم تھی مگر اس کا تجربہ اب ہوا ہے، اب یہ مجھے محض اپنے ذہن سے ہی نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے، اپنے دل سے، اپنے پیٹ کے اندر سے بھی معلوم ہے۔ اور یہ اچھا ہوا کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا۔

وہ دیر تلک اپنی اس کایا کلپ پر سوچتا رہا، اس چڑیا کو چہچہاتے ہوئے سنتا رہا۔ اگر اس کے بھیتر کی چڑیا مر جاتی تو ساتھ میں وہ خود بھی مر جاتا؟ نہیں، اس کے اندر کوئی اور چیز مر گئی، ایسی چیز جس کے بارے میں وہ مدت سے سوچتا تھا کہ کاش یہ ختم ہو جائے۔ کیا یہ وہی چیز نہیں ہے جس کو اس نے تپسیا میں بیتے اپنے پرشوق برسوں میں مٹا دینا چاہا تھا۔ کیا یہ اس کی ذات، اس کی چھوٹی سی، سہمی ہوئی، سر بلند ذات نہیں تھی، جس سے وہ برسوں سے کشتی لڑ رہا تھا، مگر جو ہر بار اسے پھر زیر کر لیتی، جو ہر بار اور بار بار ظاہر ہو جاتی، جو اس سے خوشیاں چھین لیتی اور اس کو خوف سے بھر دیتی؟ کیا وہ یہی نہیں تھی جو آج اس جنگل میں اس من موہن دریا کنارے اپنی موت آپ مر گئی تھی؟ کیا اس کی موت کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بالکل بچہ محسوس کر رہا تھا، اس قدر خوشی اور اعتماد سے بھرپور اور بغیر کسی خوف کے؟

سدھارتھ کو اب معلوم ہوا کہ وہ اب تک اس ذات سے اپنی کشمکش میں کیوں ناکام رہا حالانکہ وہ برہمن تھا اور تپسوی تھا۔ بہت زیادہ علم نے اسے روکے رکھا۔ بہت سارے مقدس اشلوک، چڑھاوے کی رسموں اور نفس کشی کی عادت، بہت زیادہ کام اور بہت زیادہ کوشش نے اسے روکے رکھا۔ سو وہ بہت گھمنڈی تھا، وہ ہمیشہ سب سے زیادہ ذہین، سب سے زیادہ مستعد تھا۔ ہمیشہ دوسروں سے دو قدم آگے، وہ ہمیشہ عالم فاضل اور ذہین بنتا، ہمیشہ بھکشو یا

ودیا دھر بنتا۔اس کی ذات اس سادھنا میں، اس گھمنڈ میں، اس ودیا میں رینگ کر گھس گئی تھی ۔وہ وہاں جم کر بیٹھ گئی تھی اور پھلنے پھولنے لگی، اور وہ سمجھتا رہا کہ وہ فقر وفاقے سے،توبہ واستغفار سے اس ذات کو ختم کر رہا ہے۔اب اس کی سمجھ میں آیا اور اسے احساس ہوا کہ بھیتر کی آواز ٹھیک کہتی تھی ۔کوئی گرو اسے مکتی نہیں دلا سکتا تھا۔اسی لئے تو اسے سنسار میں پھنسنا پڑا، ناری، دھن اور شکتی کے جال میں پھنسنا پڑا تھا، اسی لئے تو اسے بیوپاری بننا تھا، جواری اور شرابی اور دھنوان بننا تھا یہاں تک کہ اس کے بھیتر کا سنیاسی اور سادھو مر جائے ۔اسی لئے تو اسے ان بھیانک برسوں کو جھیلنا تھا، متلی برداشت کرنی تھی، اور یہ سبق سیکھنا تھا کہ وہ کھوکھلی، لاحاصل زندگی کے باؤلے پن کو اس وقت تک جیئے جائے جب تک کہ وہ نراش کا کڑوا مزہ نہ چکھ لے، تاکہ لذتوں کا جویا سدھارتھ اور جائیداد کا مالک سدھارتھ اپنی موت آپ نہ مر جائیں ۔وہ مر چکا تھا اور اس نیند سے ایک نیا سدھارتھ جاگا تھا۔اب وہ بھی بوڑھا ہوگا اور مر جائے گا۔سدھارتھ بھی عارضی تھا، ساری شکلیں عارضی ہیں، مگر آج وہ نوجوان تھا، بچہ تھا۔ایک نیا سدھارتھ تھا۔۔۔۔اور وہ بہت خوش تھا۔

اس کے دماغ میں یہ خیالات آنے لگے۔مسکراتے ۔ہوئے وہ اپنے پیٹ کی آواز سنتا رہا، جنگل میں گنگناتی مدھ ماکھیوں کو تشکر کے ساتھ سنتا رہا۔خوش ہو کر اس نے بہتے دریا کو دیکھا۔کبھی کسی دریا نے اس کو اتنا نہیں لبھایا تھا۔بہتے پانی کی آواز اور روپ اسے کبھی اتنے پیارے نہیں لگے تھے ۔اسے یوں لگا کہ یہ بہتا دریا اسے کوئی اہم بات بتا رہا ہے،کوئی بات جو اسے ابھی نہیں معلوم،کوئی ایسی چیز جو اس کی راہ دیکھ رہی ہے ۔سدھارتھ نے اپنے آپ کو اس دریا میں غرق کر دینا چاہا تھا، پرانا ، دکھی، تھکا ہارا اور مایوس سدھارتھ آج اس دریا میں ڈوب چکا تھا۔اور اس نئے سدھارتھ کو بہتے پانی سے اتنا لگاؤ محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے فیصلہ کیا وہ بہت عرصے تک اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔

©۔جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

سدھارتھ
ہرمن ہیسے
مترجم: آصف فرخی

قسط نمبر12

ماجھی

میں اس دریا کے پاس رہوں گا، سدھارتھ نے سوچا۔ یہی تو وہ دریا ہے جو شہر جاتے سمے میں پار کیا تھا۔ وہ مہربان ملاح مجھے پار لے کر گیا تھا۔ میں اس کے پاس جاؤں گا۔ میرا راستہ اس کی کٹیا کے پاس سے ہوتا ہوا مجھے ایک نئی زندگی تک لے گیا تھا، جو اب پرانی اور مردہ ہو چکی ہے۔ کاش میرا موجودہ راستہ اور میری زندگی پھر وہیں سے شروع ہو۔

اس نے محبت بھری نظروں سے اس بہتے پانی کو دیکھا، اس کے شیتل ہرے رنگ کے اندر جھانکا، اس میں بنتی بگڑتی حیرت انگیز تصویروں کے بلوریں کٹاؤ میں جھانکا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی گہرائیوں سے آبدار موتی ڈبک رہے ہیں، آئینے کی سی سطح پر بلبلے تیر رہے ہیں اور ان میں نیلا آسمان جھلک رہا ہے۔ دریا اپنی ہزار آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ہری، سفید، بلوریں، آسمانی آنکھیں۔ کتنی محبت تھی اسے دریا سے، دریا اسے کیسا مسحور کر دیتا تھا، کس قدر شکر گزار تھا وہ اس دریا کا! اپنے من کے بھیتر اس نے نئی جاگتی ہوئی آواز کو سنا اور اس آواز نے یہ کہا: ''اس دریا سے پیار کرو، اس کے ساتھ رہو، اس سے سیکھو۔'' ہاں، وہ اس سے سیکھنا چاہتا تھا، وہ اسے سننا چاہتا تھا۔ اسے یوں لگا کہ جو بھی دریا کو اور اس کے بھید کو جان لے گا وہ بہت کچھ سیکھ لے گا۔۔۔۔ بہت سے بھید، سارے بھید۔

مگر آج اس نے دریا سے بس ایک ہی بھید پایا، ایسا بھید جس نے اس کی آتما کو جا پکڑا۔ اس نے دیکھا کہ پانی بہتا ہے اور بہے جاتا ہے اور پھر بھی ہمیشہ وہیں رہتا ہے۔ پانی ہمیشہ ایک سا رہتا ہے اور پھر بھی ہر لمحے نیا ہوتا ہے۔ یہ کون سمجھ سکتا تھا، اس کا تصور کر سکتا تھا۔ وہ اسے نہیں سمجھ سکا، وہ بس ایک دھندلے سے شبہے، دھندلی یاد اور غیبی آوازوں سے واقف تھا۔

اس کا تصور کر سکتا تھا۔ وہ اسے نہیں سمجھ سکا، وہ بس ایک دھندلے سے شبہے، دھندلی یاد اور غیبی آوازوں سے واقف تھا۔

سدھارتھ اٹھا، بھوک ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ وہ دریا کنارے ٹہلتا رہا، پانی کی آواز سنتا رہا، خالی پیٹ میں بھوک کی آواز سنتا رہا۔

جب وہ گھاٹ پر پہنچا تو ناؤ وہاں پر موجود تھی، اور وہ ماجھی، جس نے ایک دفعہ ایک نوجوان سنیاسی کو پار اتارا تھا، وہ ناؤ میں کھڑا تھا۔ سدھارتھ نے اسے پہچان لیا۔ وہ بھی عمر رسیدہ ہو گیا تھا۔

''مجھے پار لے جاؤ گے؟'' سدھارتھ نے پوچھا۔

ماجھی یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ عمدہ لباس پہنے ایک شخص تن تنہا اور پیادہ پا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے اسے بٹھا لیا اور چل پڑا۔

''تم نے اچھی زندگی چنی ہے۔'' سدھارتھ نے کہا۔ ''کتنا بھلا لگتا ہو گا کہ دریا کنارے رہو اور روزانہ اس پر ناؤ چلاؤ۔''

ناؤ کا کھیون ہارا عسکرایا اور ناؤ سہج سہج ڈولنے لگی۔

''اچھا تو ہے، جیسا آپ کہہ رہے ہیں، مگر کیا ہر کام، ہر زندگی اچھی نہیں ہوتی؟''

''شائد، مگر مجھے تمہاری زندگی پر رشک آتا ہے۔''

''ہوں، آپ کا یہ شوق جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ اچھے کپڑے پہننے والوں کے بس کا روگ نہیں۔''

سدھارتھ ہنس دیا۔ ''آج ایک اور دفعہ بھی میرے کپڑوں کی وجہ سے مجھ پر اعتراض ہوا تھا۔ کیا تم میرے یہ کپڑے قبول کر لو گے کہ یہ مجھے وبال معلوم ہوتے ہیں، اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میرے پاس پیسے نہیں جو تمہاری اجرت دے سکوں۔''

''آپ مذاق کر رہے ہیں۔'' ماجھی ہنسنے لگا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا، دوست۔۔۔۔ تم ایک مرتبہ پہلے بھی مجھے پیسے لئے بنا پار لے گئے تھے، تو آج بھی یہ مہربانی کر دو اور پیسے کے بجائے میرے کپڑے لے لو۔''

''اور آپ کپڑوں کے بغیر آگے کیسے جائیں گے؟''

''مجھے آگے جانے کا کوئی شوق نہیں۔ اگر ہو سکے تو مجھے اپنے کچھ پرانے کپڑے دے دو اور مجھے اپنے ساتھ رکھ لو۔ اپنا شاگرد بنا لو مجھے تاکہ میں ناؤ سنبھالنا جان جاؤں۔''

ماجھی اس اجنبی کو دیر تک دیکھتا رہا۔

''میں تمہیں پہچان گیا۔'' اس نے بالآخر کہا ''تم ایک دفعہ میری کٹیا میں سوئے تھے۔ بہت مدت ہو گئی، شاید بیس سال سے بھی پہلے۔ میں تمہیں دریا پار لے گیا تھا اور ہم دوست بن کر جدا ہوئے تھے۔ اس وقت تم سنیاسی نہیں تھے

؟ مجھے تمہارا نام نہیں یاد آ رہا۔''

''میرا نام سدھارتھ ہے اور جب تم نے مجھے دیکھا تھا تو میں سنیاسی تھا۔''

''خوب آئے، سنیاسی۔'' میرا نام واسودیو ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم میرے مہمان بنو گے اور میری کٹیا میں سوؤ گے اور اور مجھے بتاؤ گے کہ تم کہاں سے آ رہے ہو اور اپنے ان عمدہ کپڑوں سے کیوں اوبھ گئے ہو۔''

وہ دریا کے بیچ میں پہنچ گئے تھے اور مخالف بہاؤ کی وجہ سے واسودیو زور زور سے چپو چلا رہا تھا۔ وہ اپنے مضبوط بازوؤں سے ناؤ کھے رہا تھا اور بہت سکون سے کشتی کے سرے کو دیکھ رہا تھا۔ سدھارتھ بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور یاد کرتا رہا کہ کس طرح جب وہ سنیاسی تھا تو اس آدمی سے انس رکھتا تھا۔ اس نے شکریے کے ساتھ واسودیو کی دعوت قبول کر لی۔ جب وہ دریا کنارے پہنچے تو سدھارتھ نے ناؤ باندھنے میں واسودیو کی مدد کی۔ پھر وہ اسے لے کر کٹیا میں آ گیا، اسے پانی اور روٹی دی جو سدھارتھ نے خوش ہو کر کھائی۔ اور آم بھی کھائے جو واسودیو اس کے لئے چن کر لایا تھا۔

اس کے بعد جب سورج ڈھلنے لگا تو وہ دریا کنارے ایک پیڑ کے ٹھنٹھ پر بیٹھ گئے اور سدھارتھ نے اسے اپنی رام کہانی سنائی اور بتایا کہ کس طرح وہ یاس اور نا امیدی کے لمحوں سے گزر چکا ہے، اور آج ان سے نکلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ یہ کہانی رات گئے تک چلتی رہی۔

واسودیو بہت غور سے سنتا رہا، اس نے سدھارتھ کے پر یوار، اس کے بچپن، اس کی تعلیم، اس کی جستجو، اس کی خوشیوں اور اس کی ضرورتوں، سب کے بارے میں سنا۔ اس مانجھی کی خوبیوں میں سے اہم ترین صفت یہ تھی کہ وہ ان نایاب لوگوں میں سے ایک تھا جو سننا جانتے ہیں۔ وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہتا اور بولنے والے کو یوں لگتا کہ واسودیو اس کا ایک ایک حرف اپنے دل میں اتار رہا ہے، خاموشی سے، توقع کے ساتھ اور یہ کہ کوئی بات اس سے چھپ نہیں جاتی۔ وہ کسی چیز کے انتظار میں بے صبری نہیں کرتا اور نہ کسی چیز کی تعریف کرتا ہے نہ الزام دھرتا ہے ۔۔۔۔ وہ بس سنتا رہتا ہے۔ سدھارتھ نے سوچا کہ ایسے سننے والا کا ہونا بھی کتنا اچھا ہے جو دوسرے کی زندگی میں، اس کی جستجو میں، اس کے دکھ درد میں ڈوب سکتا ہو۔

لیکن جب سدھارتھ کی کہانی ختم ہونے لگی اور جب وہ دریا کنارے کے پیڑ اور اپنی نراشا کے بارے میں بتا رہا تھا، اوم کے شبد کا ذکر کر رہا تھا اور یہ سنا رہا تھا کہ نیند سے جاگنے کے بعد اسے دریا سے کیسی الفت محسوس ہونے لگی تو مانجھی دگنی توجہ سے سننے لگا اور آنکھیں بند کئے کئے اس میں بالکل ڈوب گیا۔

جب سدھارتھ کہہ چکا تو خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا، پھر واسودیو نے کہا:

''مجھے بھی یہی خیال آیا تھا، دریا نے تم سے کلام کیا ہے۔ وہ تم پر مہربان بھی ہے، تم سے بات کرتا ہے۔ اچھا ہے، بہت اچھا ہے۔ میرے ساتھ رہو، سدھارتھ، میرے دوست۔ ایک زمانے میں میری پتنی تھی اور اس کا کھولا میرے ساتھ بچھتا تھا، مگر اسے مرے ہوئے مدت گزر گئی۔ میں بہت عرصے سے اکیلا رہ رہا ہوں۔ آؤ میرے ساتھ رہو، یہاں ہم دونوں کے لئے جگہ اور غذا ہے۔''

''بہت شکریہ۔'' سدھارتھ نے کہا۔ ''میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ اور اے واسودیو تمہارا شکریہ کہ تم نے میری بات سنی۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو سننے کا فن جانتے ہیں، اور مجھے آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو اس کام میں تم سے بہتر ہو۔ میں بہت احترام کے ساتھ تم سے یہ بھی سیکھوں گا۔''

''تم سیکھ جاؤ گے۔'' واسودیو نے کہا' مگر مجھ سے نہیں۔ مجھے سننا اس دریا نے سکھایا ہے، تم بھی اسی سے سیکھ لو گے۔ دریا سب جانتا ہے، آدمی اس سے سب کچھ سیکھ سکتا ہے۔ تم نے دریا سے یہ تو سیکھ ہی لیا ہے کہ نیچے جانے کی کوشش کرنا چاہیے، ڈوب جانا چاہیے، گہرائیوں کی جستجو کرنا چاہیے۔ دھنوان اور پونجی پتی سدھارتھ ایک دن ناؤ کا کھیون ہار بن جائے گا، گیانی اور ودیا دھر برہمن سدھارتھ ایک دن مانجھی بن جائے گا۔ مگر تم نے یہ بھی دریا سے سیکھا ہے۔ تم اس سے اور بھی باتیں سیکھو گے۔''

ایک طویل وقفے کے بعد سدھارتھ نے کہا: ''اور کون سی باتیں، واسودیو؟''

واسودیو اٹھا۔ ''دیر ہو گئی۔'' اس نے کہا۔ ''چلو لیٹ رہیں۔ میرے دوست میں تمہیں نہیں بتا سکتا کہ اور کون سی بات ہے۔ میں پڑھا لکھا نہیں ہوں، مجھے باتیں کرنا اور سوچنا نہیں آتا۔ مجھے بس سننا آتا ہے، اور سیدھے سبھاؤ سے رہنا آتا ہے۔ اس کے سوا میں نے کچھ نہیں سیکھا۔ اگر مجھے باتیں کرنا اور پڑھانا آتا تو شاید میں استاد بن جاتا مگر میں تو صرف ایک مانجھی ہوں اور میرا کام لوگوں کو دریا کے پار لے جانا ہے۔ میں ہزاروں کو دریا پار لے جا چکا ہوں اور ان سب کے لئے میرا دریا سفر میں ایک رکاوٹ تھا۔ وہ دولت اور بیوپار کے لئے سفر کرتے ہیں۔ شادیوں اور یاترا کے لئے سفر پر جاتے ہیں، دریا ان کے راستے میں پڑتا ہے اور مانجھی اس لئے ہوتا ہے کہ انکو اس کشٹ سے نکال دے۔ مگر ان ہزاروں میں سے چند لوگ ایسے ہوتے ہیں، شاید چار یا پانچ، جن کے واسطے دریا رکاوٹ نہ بنا۔

انہوں نے دریا کی آواز سنی اور اس کو بولتے سنا اور دریا ان کے لئے مقدس ہوگیا، جیسے میرے لئے ہوگیا ہے۔ آؤ اب لیٹ رہیں، سدھارتھ۔''

سدھارتھ ماجھی کے ساتھ رہنے لگا اور اس نے سیکھا کہ کشتی کی دیکھ بھال کس طرح کی جائے اور جب گھاٹ پر کچھ کرنے کو نہ ہوتا تو وہ واسودیو کے ساتھ دھان کے کھیت میں کام کرتا، لکڑیاں چنتا اور کیلے کے پیڑوں سے کیلے توڑتا۔ اس نے چپو بنانے سیکھے اور ٹوکریاں بننی سیکھیں۔ وہ جو کام کرتا اس میں خوش رہتا اور سیکھتا جاتا اور دن اور مہینے جلدی جلدی گزرنے لگے۔ واسودیو جو کچھ اسے سیکھا سکتا تھا اس کی بہ نسبت اس نے دریا سے زیادہ سیکھا۔ وہ سارے وقت دریا سے سیکھتا رہتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے دریا سے سننے کا فن سیکھا کہ سنا کس طرح جائے، کس طرح شانت ہردے کے ساتھ منتظر اور کشادہ ذہن کے ساتھ سنا جائے، کسی جذبے کے بغیر، کسی خواہش کے بغیر، کوئی فیصلہ اور کوئی رائے قائم کئے بغیر۔

وہ واسودیو کے ساتھ خوش تھا اور کبھی کبھار وہ دونوں آپس میں الفاظ کا تبادلہ کر لیتے، گنے چنے الفاظ۔ واسودیو لفظوں کو دوست نہیں رکھتا تھا۔ سدھارتھ شاذونادر ہی اس کو بولنے پر اُکسا پاتا۔

اس نے ایک دفعہ پوچھا: ''تم نے دریا سے یہ بھید بھی سیکھا ہے کہ وقت کچھ نہیں ہوتا۔؟''

واسودیو کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ہاں' سدھارتھ۔'' اس نے کہا۔ ''کیا اس بات سے تمہارا مطلب یہ ہے کہ دریا ایک ہی وقت میں ہر جگہ ہوتا ہے، اپنے سُوتے پر اور اپنے دہانے پر، جھرنے اور گھاٹ پر، بھنور میں اور سمندر میں، پہاڑوں، پر، ہر جگہ اور اس کے لئے صرف لمحہ موجود ہی ہوتا ہے، نہ گزشتہ کا یہ نہ آئندہ کا سایہ۔''

''ہاں' ایسا ہی ہے۔'' سدھارتھ بولا۔ ''اور جب میں نے یہ سیکھا تو میں نے اپنے جیون پر نظر دوڑائی اور وہ بھی ایک دریا ہے، بالک سدھارتھ، نوجوان سدھارتھ بڈھا سدھارتھ دراصل سائے کے ذریعے ہی الگ بٹے ہوئے ہیں، حقیقت میں نہیں۔ سدھارتھ کے پچھلے جنم ماضی کا قصہ نہیں ہیں اور اس کی موت، جب وہ برہما میں لوٹ جائے گا، مستقبل کی بات نہیں ہے۔ کچھ نہیں تھا نہ کچھ ہوگا، ہر شے کی حقیقت اور وجود ہوتا ہے۔''

سدھارتھ خوشی خوشی بولے جا رہا تھا، اس دریافت نے اسے خوش کر ڈالا تھا۔ لیکن سارے دکھ سمے کے اندر نہیں تھے، تمام خود اذیتی اور خوف وقت میں مضمر نہیں تھے؟ کیا تمام مشکلات اور شر اس وقت زیر نہیں ہو جاتے جوں ہی انسان وقت پر فتح پا لیتا ہے اور وقت کے طلسم سے چھوٹ جاتا ہے؟ اس نے خوش ہو کر بات کہی مگر واسودیو مسکرا دیا اور اثبات میں سر ہلانے لگا۔ اس نے سدھارتھ کے شانے پر ہاتھ دھرا اور پھر اپنے کام کی طرف پلٹ گیا۔

اور جب ساون بھادوں میں دریا اور بھی زور سے چنگھاڑنے لگا تو سدھارتھ نے کہا: ''کیا یہ سچ نہیں، میرے دوست، کہ دریا کی بہت ساری آوازیں ہیں؟ اس کی آوازوں میں راجہ کی آواز، جنگجو سورما کی آواز، بیل کی آواز، رات کے پرندوں کی بولیاں، حاملہ عورت کی آواز اور آدمی کی سسکیوں کی آواز اور ہزاروں دوسری آوازیں کیا شامل نہیں؟''

''ہاں' ایسا ہی ہے۔'' واسودیو نے کہا۔ ''تمام مخلوق کی آوازیں اس کی آواز میں ہیں۔''

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

سدھارتھ
ہرمن ہیسے
مترجم: آصف فرخی

قسط نمبر13

''اور تم جانتے ہو' سدھارتھ کہہ رہا تھا'' کہ جب آدمی ایک ہی وقت میں اس کی ہزاروں آوازیں سن لیتا ہے تو کون سا لفظ بنتا ہے؟''

واسودیو نے خوشی کا قہقہہ لگایا، وہ سدھارتھ کی طرف جھکا اور اس کے کان میں اوم کا مقدس شبد چپکے سے دہرا دیا۔ اور یہی تو وہ بات تھی جو سدھارتھ سننا چاہتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا سدھارتھ کی مسکراہٹ اس مانجھی کی سی ہونے لگی، اسی طرح دمکتی ہوئی، اسی طرح خوشیوں سے بھرپور، اسی طرح ہزاروں جھریوں کے بیچ سے چمکتی ہوئی، اسی طرح بچکانہ، اسی طرح سٹھیائی ہوئی۔ بہت سے مسافر دونوں کشتی بانوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر انہیں بھائی بھائی سمجھتے۔ اکثر وہ شام گئے دریا کنارے پیڑ کے ٹھنٹھ پر بیٹھ جاتے۔ وہ دونوں خاموشی سے پانی کی آواز سنتے، جوان کے لئے محض پانی کی آواز نہ تھی بلکہ زندگی کی آواز تھی، اس وجود کی آواز، ہونے کے ایک رواں سلسلے کی آواز تھی۔ اور کبھی یہ ہوتا کہ دریا کو سنتے سنتے وہ دونوں ایک سی بات سوچتے، شاید پچھلے کسی دن کی باتیں، یا مسافروں میں سے کسی کے بارے میں جس کی تقدیر یا حالات ان کے من کو گھیر لیتے یا موت یا اپنے بچپن کے بارے میں، اور جب دریا ایک ہی وقت میں دونوں کو کوئی اچھی بات سناتا تو وہ ایک دوسرے کو دیکھتے دونوں ایک ہی بات سوچتے اور دونوں ایک ہی سوال کے ایک ہی جواب پر خوش ہو جاتے۔

اس ناؤ اور اس کے مانجھیوں میں سے کوئی چیز ظہور کرتی تھی جس کا احساس بہت سے مسافروں کو ہو جاتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی مسافر ان کا چہرہ دیکھ لیتا اور اپنی زندگی اور اپنے دکھ انہیں بتانے لگتا، گناہوں کا اعتراف کرتا، ان سے تسلی اور مشورہ مانگتا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ کوئی ان سے اجازت مانگتا کہ شام وہاں گزارے اور دریا کو سنے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوتا کہ لوگ یہ سنکر کہ دریا کنارے دو بزرگ، جو جادوگر ہیں یا بھکشو ہیں، ناؤ چلاتے ہیں، تجسس کے مارے وہاں آ جاتے۔ یہ متجسس لوگ بہت سوال پوچھتے اور انہیں کوئی جواب نہ ملتا، نہ جواب نہ جادوگر نہ داتا بزرگ۔ انہیں تو بس دو خوش مزاج بڈھے ملتے، جو دیکھنے میں گونگے اور کچھ عجیب سنکی سے لگتے۔ اور یہ متجسس لوگ ہنستے اور کہتے کہ لوگ بھی کتنے مورکھ اور کانوں کے کچے ہیں کہ ایسی افواہیں پھیلاتے رہتے ہیں۔

سال گزرتے رہے اور کسی نے ان کا شمار نہیں کیا۔ پھر ایک دن کچھ بھکشو وہاں سے گزرے جو گوتم بدھ کے چیلے تھے، اور انہوں نے دریا پار جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ان سے مانجھیوں کو پتہ چلا کہ وہ جلد از جلد اپنے مہان گرو کے پاس جانا چاہتے ہیں کیونکہ یہ چیتاونی پھیل گئی تھی کہ تتھاگت بہت بیمار ہے اور اب جلد ہی اپنی آخری انسانی موت کا دکھ بھوگتے اور مکتی پا جائے گا۔ کچھ دنوں بعد بھکشوؤں کا ایک اور گروہ آیا، پھر ایک اور۔ بھکشوؤں کے علاوہ دوسرے مسافر بھی گوتم بدھ اور اس کی آنے والی موت ہی کی باتیں کرتے۔ اور جس طرح چار جانب سے لوگ کسی فوج کی مہم میں یا بادشاہ کی تاج پوشی میں جمع ہو جاتے ہیں، تو اسی طرح وہ یوں جمع ہو رہے تھے جیسے مکھیوں کا چھتہ، ایک مقناطیس سے کھنچے چلے آ رہے تھے، وہاں جا رہے تھے جہاں مہان اور وشال بدھ بستر مرگ پر پڑا تھا، جہاں یہ سانحہ ہونے والا تھا اور جہاں ایک عہد کا نجات دہندہ عالم ابدیت میں داخل ہونے والا تھا۔

اس زمانے میں سدھارتھ اس مرد دانا کے بارے میں بہت سوچتا رہا جس کی آواز نے ہزاروں دلوں میں ہلچل مچا دی تھی، جس کی آواز اس نے بھی ایک مرتبہ سنی تھی، جس کا مقدس چہرہ ایک دفعہ اس نے بھی احترام کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس نے بہت عقیدت سے اسے یاد کیا، اس کی بتائی ہوئی راہ نجات کو یاد کیا اور مسکراتے ہوئے ان الفاظ کو یاد کیا جو ایک نوجوان کی حیثیت سے اس نے تتھاگت سے کہے تھے اور اسے محسوس ہوا کہ ان شبدوں میں گھمنڈ تھا اور وہ قبل از وقت تھے۔ بہت دنوں سے اسے یہ معلوم تھا کہ وہ ان تعلیمات کو مان تو نہ سکا مگر وہ گوتم بدھ سے الگ بھی نہیں ہوا۔

نہیں، ایک سچا کھوجنے والا کسی بھی تعلیم کو قبول نہیں کر سکتا، اگر وہ واقعی کچھ پانا، کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے تو۔ مگر وہ جو پا لیتا ہے وہ ہر راستے، ہر منزل کی تصدیق کر سکتا ہے، کوئی بھی چیز اسے ان ہزاروں سے جدا نہیں کرتی جو ابدیت میں زندہ ہیں، جن کے ہر ہر سانس میں وہ الوہی شے موجود ہے۔

ایک دن، جب بہت سارے لوگ قریب المرگ بدھ کی زیارت کی غرض سے یاترا پر نکلے ہوئے تھے، تو ان میں کملا بھی اسی راستے پر نکلی ہوئی تھی، کملا جو کبھی سب کنچنیوں سے سندر تھی۔ وہ اپنے پچھلے طور طریق کب کے چھوڑ چکی تھی۔ اس نے اپنا باغ گوتم کے بھکشوؤں کو دے ڈالا تھا، اس کی تعلیمات میں پناہ ڈھونڈی تھی اور یاتریوں کی سرپرستی کرتی تھی۔ گوتم کے مرض الموت کا حال سن کر وہ پیادہ پا نکل کھڑی ہوئی، موٹے جھوٹے کپڑے پہنے اور اپنے بچے کو ساتھ لے لیا۔ راستے میں وہ دریا پر پہنچے مگر بچہ جلد ہی تھک گیا، وہ ضد کرنے لگا کہ میں گھر جاؤں گا، میں تھک گیا، مجھے بھوک لگی ہے۔ وہ بہت ضدی تھا اور جلدی روٹھ جاتا تھا۔ کملا کو بار بار اس کی خاطر رک کر سستانا پڑتا۔ بچہ ضد میں آ کر اس کے مقابلے پر ڈٹ جانے کا عادی تھا، کملا اسے کھلاتی پلاتی، بہلاتی اور ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتی۔

پھر بھی بچے کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کی ماں بھلا کس لئے یہ تھکا دینے والی، آفت کی ماری یاترا کر رہی ہے، بس ایک اجنبی کو دیکھنے کے لئے جو بہت نیک تھا اور مرنے والا تھا۔ بلا سے مر جائے۔ بچے کے لئے کیا فرق پڑتا تھا؟
یہ دونوں یاتری واسودیو کی ناؤ سے دور نہ تھے کہ ننھے سدھارتھ نے ماں سے کہا کہ مجھے ستاتا ہے۔ کملا خود بھی تھک رہی تھی اور بچہ کیلا کھانے لگا تو وہ زمین پر ڈھیر ہوگئی، آنکھیں موند لیں اور ستانے لگی۔ لیکن اچانک اس نے چیخ ماری۔ بچہ گھبرا گیا اور اس نے دیکھا کہ اس کا منہ خوف کے مارے پیلا پڑ گیا۔ اس کے کپڑوں میں سے کالا ناگ اسے ڈس کر رینگتا ہوا نکلا۔
بچہ چیختا چلاتا ہوا لوگوں کو بلانے کے لئے بھاگا۔ جب وہ ناؤ کے پاس پہنچے تو کملا ڈھیر ہوگئی اور اس سے آگے نہ جا سکی، بچہ مدد کے واسطے پکارنے لگا اور ماں کو چومتا، لپٹا جاتا۔ وہ بھی اس کے ساتھ پکارنے لگی، یہاں تک کہ ان کی آوازیں واسودیو کے کانوں میں پہنچیں جو وہاں اپنی ناؤ کے پاس کھڑا تھا۔ وہ بھاگا بھاگا آیا، عورت کو گود میں سہارا دیا اور اسے کٹیاں میں لے چلا۔ بچہ بھی اس کے ساتھ ہولیا اور وہ کٹیا میں جا پہنچے جہاں سدھارتھ آگ جلا رہا تھا۔ اس نے نظر اٹھائی اور بچے کا چہرہ دیکھا، اور دیکھ کر سوچنے لگا کہ اس بچے کو دیکھ کر کوئی بات یاد آ رہی ہے، مگر کیا؟ پھر اس نے کملا کو دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا حالانکہ وہ مانجھی کی گود میں بے سدھ پڑی تھی، پھر اسے پتا چلا کہ جس بچے کو دیکھ کر اسے کوئی چیز سی یاد آنے لگی تھی وہ اس کا اپنا بیٹا ہے، اور اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔
کملا کا گھاؤ دھو دیا گیا تھا مگر وہ سیاہ پڑ چکا تھا، اور اس کا جسم پھول رہا تھا۔ اسے قوت بخش دوا پلائی گئی اور وہ ہوش میں آ گئی۔ وہ سدھرتھ کی کٹیا میں سدھارتھ کے بستر پر لیٹی ہوئی تھی، وہی سدھارتھ جس سے اس نے بے حد عشق کیا تھا، وہ اسے جھک کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھی کہ وہ سپنا دیکھ رہی ہے اور مسکرا کر اپنے پریمی کا مکھڑا دیکھنے لگی۔ دھیرے دھیرے اسے اپنی حالت یاد آئی، سانپ کا ٹنا یاد آیا اور اس نے گھبرا کر بچے کو آواز دی۔
''چنتا مت کرو۔'' سدھارتھ نے کہا۔ ''وہ یہیں ہے۔''
کملا نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ نس میں پھیلتے زہر کے سبب اسے بولنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ ''تم بوڑھے ہو گئے، میرے پیارے۔'' اس نے کہا۔ ''تمہارے بال سفید ہو گئے ہیں، مگر پھر بھی تم اس نوجوان سنیاسی کی طرح ہو جو ایک دفعہ میرے باغ میں آیا تھا، جس کے پاس پہننے کو کپڑے نہیں تھے اور پیر دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ تم میں اب اس سنیاسی سے زیادہ مشابہت ہے بہ نسبت اس وقت کے جب تم مجھے اور کام سوامی کو چھوڑ گئے تھے۔ تمہاری آنکھیں اس کی جیسی ہیں، سدھارتھ۔ ہائے میں بھی بوڑھی ہو گئی، بوڑھی۔۔۔ تم نے مجھے پہچان لیا تھا؟''
سدھارتھ مسکرایا۔ ''میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا، من موہنی کملا!''
کملا نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے اسے بھی پہچان لیا؟ یہ تمہارا بیٹا ہے۔''
اس کی پتلیاں پھرنے لگیں اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ بچہ رونے لگا۔ سدھارتھ نے اسے گود میں اٹھا لیا، اس کے آنسو پونچھ دیئے اور اس کے بال سنوارنے لگا۔ بچے کو دیکھتے ہوئے اسے برہمنوں کی ایک پرارتھنا یاد آ گئی جو اس نے تب یاد کی جب وہ خود اس بچے جتنا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ یہ پرارتھنا دہرانے لگا، بچپن کے بیتے سمے سے بھولے ہوئے پرارتھنا کے شبد اسے یاد آنے لگے۔ بچہ اس کی آواز سن کر چپ ہو گیا، سسکیاں بھرنے لگا، پھر سو گیا۔ سدھارتھ نے اسے واسودیو کے بچھونے پر لٹا دیا۔
واسودیو آگ پر چاول پکا رہا تھا۔ سدھارتھ نے واسودیو کو دیکھا اور مسکرا دیا۔
''وہ مر رہی ہے۔'' سدھارتھ نے ہولے سے کہا۔
واسودیو نے سر ہلا دیا۔ آگ کی روشنی اس کے مہربان چہرے پر پھیل رہی تھی۔ کملا کو پھر ہوش آ گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ لکھا ہوا تھا۔ سدھارتھ نے اس کے ہونٹوں پر، اس کے بے رونق چہرے پر دکھ کی تحریر پڑھ لی۔ اس نے یہ تحریر جلدی سے پڑھ لی اور توجہ کے ساتھ، انتظار کرتے ہوئے اور اس کا دکھ بانٹتے ہوئے پڑھ لی۔ کملا کو بھی اس کا احساس تھا، اس کی نگاہیں اس کو ڈھونڈ رہی تھیں۔
اسے دیکھتے ہوئے وہ کہنے لگی: ''اب میں نے دیکھ لیا کہ تمہاری آنکھیں بھی بدل گئی ہیں۔ بالکل بدل گئی ہیں۔ میں کیسے پہچانوں کہ سدھارتھ ہو! تم سدھارتھ ہو اور سدھارتھ کے جیسے نہیں ہو۔''
سدھارتھ کچھ نہ بولا، وہ خاموش کھڑا رہا اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔
''تمہیں مل گئی؟'' وہ پوچھنے لگی۔ ''تمہیں شانتی مل گئی؟''
وہ مسکرا دیا اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
''ہاں۔'' وہ بولی ''میں نے دیکھ لی۔ مجھے بھی مل جائے گی شانتی۔''
سدھارتھ نے سرگوشی کی: ''تمہیں مل چکی ہے شانتی۔''

کملا نے ایک ٹک اس کو دیکھا۔ وہ گھر سے اس لئے نکلی تھی کہ گوتم بدھ کو دیکھنے کی خاطر یاترا کرے، تتھاگت کا مکھ دیکھے، اس کی شانتی میں سے کچھ حاصل کر لے مگر اسے تو بس سدھارتھ ملا، اور یہ بھی اچھا ہوا، بہت اچھا ہوا، اتنا ہی اچھا کہ جیسے اس نے بدھ کو دیکھ لیا ہو۔ وہ اسے یہ بتانا چاہتی تھی مگر اس کو اب اپنی زبان پر قابو نہ رہ تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی اور وہ اس کی آنکھوں میں زندگی کو مدھم پڑتے، غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ جب آخری دکھ اس کی آنکھوں میں اترا اور غائب ہوا جب اس کے بدن سے آخری جھرجھری بھی ختم ہوگئی تو سدھارتھ کی انگلیوں نے اس کی آنکھیں بند کر دیں۔

وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھا اس کا مردہ چہرہ دیکھتا رہا۔ وہ بہت دیر تک اس کے سوکھے ہونٹوں اور بوڑھے، تھکے ہوئے دہانے کو دیکھتا رہا اور یاد کرتا رہا کہ کیسے عالم شباب میں ایک مرتبہ اس نے انہی ہونٹوں کو تازہ کٹے ہوئے انجیر سے تشبیہ دی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے بہت دیر تک اس پھیکے چہرے کو دیکھتا رہا، ان بوڑھی جھریوں کو تکتا رہا اور اس نے اپنا چہرہ دیکھا کہ اتنا ہی بے رنگ، اتنا ہی مردہ تھا اور اسی وقت اس نے اپنے اور اس کے چہرے دیکھے، جوان چہرے، سرخ ہونٹوں اور چمکتی آنکھوں والے چہرے اور اس لمحے موجود و معاصر حقیقت نے اس کو مغلوب کر دیا۔ اس وقت اس نے بہت شدت کے ساتھ زندگی کی کبھی نہ تباہ ہونے والی لافانی کیفیت، ہر لمحے کی اپنی ابدیت کو محسوس کیا۔

وہ وہاں سے اٹھا۔ واسودیو نے چاول بھات پکایا تھا مگر سدھارتھ نے کچھ نہ کھایا۔ کٹیا کے باہر جہاں بکری بندھی تھی وہاں دونوں بڈھوں نے بھوسے سے پیال بنالیا اور واسودیو لیٹ گیا۔ مگر سدھارتھ باہر چلا گیا اور رات بھر کٹیا کے سامنے بیٹھا رہا، دریا کی آواز سنتا رہا، ماضی میں ڈوبا رہا اور اپنی زندگی کے تمام ادوار سے بیک وقت متاثر ہو کر ان میں گھر بیٹھا رہا۔ مگر وہ ذرا ذرا دیر کے بعد اٹھتا اور کٹیا کے دروازے پر آتا اور کان لگا کر سنتا کہ بچہ سو رہا ہے یا نہیں۔

صبح سویرے، سورج نکلنے سے بھی پہلے، واسودیو اٹھا اور اپنے دوست کے پاس آیا۔

''تم رات بھر نہیں سوئے۔'' اس نے کہا

''نہیں، واسودیو، میں یہاں بیٹھا رہا اور دریا کو سنتا رہا۔ اس نے مجھے بہت کچھ بتایا ہے، اس نے میرا ذہن خیالات سے پر کر دیا ہے، یکتائی کے خیالات سے۔''

''تم نے بہت دکھ جھیلے ہیں، سدھارتھ، مگر میں دیکھتا ہوں کہ اداسی تمہارے دل پر نہیں چھائی۔''

''نہیں، میرے دوست، میں بھلا کیوں اداس ہوں؟ میں کبھی دھنوان تھا اور خوش تھا، اب اور زیادہ دھنوان اور خوش ہو گیا ہوں۔ مجھے میرا بیٹا مل گیا ہے۔''

''میں تمہارے بیٹے کا سواگت کرتا ہوں۔ مگر، سدھارتھ، اب ہمیں کام سے لگ جانا چاہیے۔ کملا اسی بستر پر مری جس پر میری پتنی کا دم نکلا تھا۔ ہم کملا کی چتا اسی ٹیلے پر بنائیں گے جہاں میں نے ایک مرتبہ اپنی پتنی کی چتا بنائی تھی۔''

بچہ سوتا رہا اور انہوں نے کملا کے لئے چتا بنا دی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

باب نمبر14

اس کا بیٹا

بچہ روتا ہوا اور سہما ہوا اپنی ماں کی ارتھی کے ساتھ چلا، جس وقت سدھرتھ نے اسے بیٹا کہہ کر پکارا اور واسودیو کی کٹیا میں خوش آمدید کہا تب بھی وہ سہما سہما ڈرا ڈرا رہا۔ کئی دن تک مسلسل وہ پیلا چہرہ لئے اس ٹیلے پر بیٹھا رہا جہاں شمشان واقع تھا۔ خلاؤں میں گھورتا رہا، اس نے دل کے دروازے بند کر لئے، اپنی قسمت کے خلاف جدوجہد کرتا، اس سے لڑتا رہا۔

سدھارتھ نے اس کا بہت لحاظ کیا اور اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ اس کے غم کا احترام کرتا تھا۔ سدھارتھ سمجھتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لئے اجنبی ہے اور بیٹا اس سے باپ جیسی محبت نہیں کر سکتا۔ رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا اور اس نے خود دیکھ لیا کہ گیارہ سال کا یہ لڑکا اپنی ماتا کا لاڈلا تھا اور اس کی پرورش بہت ناز و نعم میں اور امراء کے ڈھنگ سے ہوئی ہے، وہ عمدہ کھانے اور نرم بچھونے کا عادی تھا، نوکروں پر حکم چلانے کا عادی تھا۔ سدھارتھ سمجھتا تھا کہ لاڈلا اور اداس بچہ ایک دم سے اجنبی اور غربت کی ماری جگہ پر مطمئن نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے بچے پر زور نہیں ڈالا، اس نے اس کے لئے بہت کچھ کیا اور اس کیلئے ہمیشہ بہترین کھانے چن کر الگ رکھ لیتا۔ آہستہ آہستہ اور دوستانہ صبر کے ساتھ وہ اس کا دل جیت لینا چاہتا تھا۔

جب وہ لڑکا اس کے پاس آیا تھا تو سدھارتھ نے اپنے آپ کو بھاگوان اور دھنوان جانا تھا، مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا اور لڑکا تب بھی نامانوس اور چڑا ہوا رہتا، جب وہ گھمنڈی، ہٹیلا، خودسر اور سرکش ثابت ہوا، جب وہ کام سے دور بھاگتا، جب وہ بوڑھوں کی کوئی عزت نہ کرتا اور واسودیو کے درختوں سے پھل چرا کے کھا جاتا، تب سدھارتھ کو احساس ہونے لگا کہ اس کو کوئی سکھ چین نہیں، دکھ اور کٹھنائیاں ہی ملی ہیں۔ مگر وہ اس کو بہت چاہتا تھا اور اس کی محبت کے دکھ اور کٹھنائیوں کو اس سکھ چین پر ترجیح دیتا تھا جو اس کے بغیر ملتا۔

جب سے چھوٹا سدھارتھ کٹیا میں آیا تھا دونوں بڈھے کام بانٹ لیا کرتے تھے۔ واسودیو کشتی کو سنبھال لیتا اور اور سدھارتھ کٹیا اور دھان کے کھیت اپنے ذمے لے لیتا تا کہ اپنے بیٹے کے پاس بھی رہ سکے۔

کئی مہینوں تک سدھارتھ صبر کے ساتھ اس بات کا منتظر رہا کہ اس کا بیٹا اس کو سمجھ لے گا، اس کی محنت کو قبول کر لے گا اور اس کا جواب محبت سے دے گا۔ کئی مہینوں تک واسودیو یہ دیکھتا رہا، انتظار کرتا رہا اور چپ رہا۔ آخر جب ایک دن چھوٹا سدھارتھ اپنی نافرمانی اور گستاخی سے باپ کو دق کر رہا تھا اور اس نے چاول کے پیالے توڑ ڈالے تو شام کے وقت واسودیو اپنے دوست کو ایک طرف الگ لے گیا اور اس سے بات کی۔

''معاف کرنا'' اس نے کہا ''میں تمہیں اپنا دوست سمجھ کر بات کر رہا ہوں۔ میرے دوست، تمہارا بیٹا تمہیں بھی پریشان کر رہا ہے اور مجھے بھی۔ یہ نوجوان پرندہ دوسرے زندگی اور دوسرے آشیانے کا عادی ہے۔ یہ تو شہر اور دولت سے تمہاری طرح گھن اور متلی کی کیفیت لے کر نہیں بھاگا! اس نے یہ سب چیزیں اپنی مرضی کے خلاف چھوڑی ہیں۔ میں نے دریا سے پوچھ لیا ہے، میرے دوست، میں نے کئی بار پوچھا اور دریا ہنس دیا، دریا مجھ پر ہنسا اور تم پر بھی ہنسنے لگا، دریا ہماری نادانی پر ہنستے ہنستے لہرانے لگا۔ تمہارا بیٹا اس جگہ خوش نہیں رہے گا۔ تم دریا سے پوچھ کر دیکھو کہ وہ کیا کہتا ہے۔''

سدھارتھ نے بہت دکھ سے اس مہربان چہرے کو دیکھا جس پر بہت شفقت بھری جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔

''میں اس سے کیسے بچھڑ سکتا ہوں؟'' سدھارتھ نے دھیرے سے کہا ''مجھے کچھ مہلت دو، میرے عزیز دوست، میں اس کے لئے ہی لڑ رہا ہوں، میں اس کے دل تک پہنچنا چاہ رہا ہوں۔ میں اپنی محبت اور اپنے صبر سے اس کا دل جیت لوں گا۔ ایک دن دریا اس سے بھی بولے گا۔ اس سے بھی کلام کرے گا۔''

واسودیو کی مسکراہٹ میں گرم جوشی آ گئی۔ ''ہاں اور کیا، دریا اس سے بھی کلام کرے گا، اسے بھی طلب کیا جائے گا۔ وہ بھی ابدی زندگی کا حصہ ہے۔ مگر ہمیں تمہیں کیا معلوم کہ اسے کس چیز کے لئے طلب کیا جاتا ہے، اسے کس راستے، کس کام، کس دکھ کے واسطے بلایا جاتا ہے؟ یوں اس کے دکھ کم نہ ہوں گے۔ اس کا دل مغرور اور سخت ہے۔ وہ بہت دکھ اٹھائے گا۔ بہت غلطیاں کرے گا۔ بہت انیائے اور بہت پاپ کرے گا۔ یہ بتاؤ، دوست کہ تم اسے پڑھا رہے ہو؟ کیا وہ تمہارا فرماں بردار ہے؟ کیا تم اسے مارتے اور سزا دیتے ہو؟''

''تمہیں، واسودیو، میں اس میں سے کوئی کام نہیں کرتا۔''

''مجھے پتا ہے۔ تم اس سے سختی نہیں برتتے، تم اسے سزا نہیں دیتے، اس کو حکم نہیں دیتے۔۔۔۔ اس لئے کہ تم جانتے ہو کہ مہربانی سختی سے زیادہ طاقتور ہے، یہ کہ پانی چٹان سے زیادہ شکتی مان ہے، یہ کہ محبت جبر سے زیادہ قوت رکھتی ہیں۔ بہت خوب، میں تمہاری تعریف کرتا ہوں۔ مگر کیا یہ تمہاری غلطی نہیں ہے کہ تم اس پر سختی نہیں کرتے، اس کو سزا نہیں دیتے؟ کیا تم اسے اپنی محبت کی زنجیر نہیں پہنا رہے؟ کیا تم اسے روزانہ اپنی نیکی اور اپنے صبر سے شرمندہ

نہیں کرتے؟ اور اس کے لئے اور مشکلات پیدا نہیں کر رہے ہو؟ کیا تم اس گھمنڈی، بگڑے بچے کو اس ٹوٹی پھوٹی کٹیا میں دوبڈھوں کے ساتھ نہیں رکھے ہوئے جن کے لئے چاول بھی نعمت ہیں اور جن کے خیالات اس کے سے نہیں ہیں، جن کے دل بوڑھے ہو چکے ہیں اور جن کی دھڑکن کا ڈھنگ اس سے جدا ہے؟ کیا وہ ان سب باتوں کے سبب مجبور نہیں، اور کیا یہ اس کی سزا نہیں ہے؟''

سدھارتھ نے پریشان ہو کر نگاہیں زمین پر جما دیں۔ اس نے دھیرے سے پوچھا: ''تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

واسودیو نے کہا: ''اسے شہر لے جاؤ، اسے اس کی ماں کے گھر لے جاؤ۔ وہاں اس کے نوکر چاکر ابھی تو ہوں گے، اسے ان کے پاس لے جاؤ۔ اور اگر وہاں کوئی نہ ہو تو اسے کسی پنڈت کے پاس لے جاؤ صرف پڑھانے کی غرض سے نہیں، بلکہ اس لئے کہ وہ اپنی عمر کے لڑکے لڑکیوں سے ملے جلے اور اس دنیا میں رہے جس کا وہ حصہ ہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا؟''

سدھارتھ نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ''تم میرے من میں جھانک لیتے ہو۔ میں نے اس کے متعلق بہت سوچا ہے۔ مگر یہ تو اتنا پتھر دل ہے، یہ دنیا میں کیسے رہے گا؟ یہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر نہیں سمجھے گا اور یہ لذت و قوت میں گم نہیں ہو جائے گا، اپنے باپ کی غلطیاں نہیں دہرائے گا، وہ سنسار میں کھو نہیں جائے گا؟''

واسودیو پھر مسکرایا۔ اس نے سدھارتھ کی بانہہ تھام لی اور کہا: ''اس کے بارے میں دریا سے پوچھ لو! سنو، وہ اس پر ہنس رہا ہے! تم پھر بھی یہ سمجھتے ہو کہ تم نے ساری غلطیاں اس لئے کی تھیں کہ تمہارا بیٹا ان سے محفوظ رہ جائے؟ کیا تم اپنے بیٹے کو سنسار سے بچا سکتے ہو؟ کس طرح؟ ہدایات سے، دعاؤں سے، پند و نصائح کے ذریعے سے؟ میرے پیارے دوست تم وہ نصیحت والی کہانی بھول گئے، وہ برہمن زادے سدھارتھ کی کہانی جو ایک مرتبہ تم نے مجھے سنائی تھی؟ اس سدھارتھ کو کس نے پاپ سے، لوبھ سے، موہ کتھا سے بچائے رکھا؟ کیا اس کے باپ کی سادھنا، اس کے گرو کی نصیحتیں، اس کا اپنا علم اور جستجو اسے محفوظ رکھ سکے؟ وہ کون سا باپ ہے اور کون سا گرو ہے جو اسے اس کی اپنی زندگی گزارنے اور اسی کے مطابق زندہ رہنے سے باز رکھ سکتا ہے، اس کو زندگی میں گلے گلے ڈوب جانے، اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ کر لینے، اس کڑوے شربت کو پی لینے سے روک سکتا ہے، اپنا راستہ تلاش کرنے سے باز رکھ سکتا ہے؟ میرے عزیز دوست، تم کیا سمجھتے ہو کہ کوئی اس راستے سے بچ سکا ہے؟ اور کیا تمہارا چھوٹا سا بیٹا ایسا کرے گا، صرف اس واسطے سے کہ تم یہ نہیں چاہتے کہ وہ دکھ اور درد اور دھوکا دیکھے؟ لیکن تم اگر اس کے لئے ایک نہیں دس دفعہ مر بھی جاؤ تب بھی تم اس کی تقدیر ذرہ برابر نہیں بدل سکتے۔''

واسودیو نے اتنی بہت سی باتیں کبھی نہ کہی تھیں۔ سدھارتھ نے اس کا شکریہ ادا کیا، اپنا دکھ سنبھالے سنبھالے کٹیا تک آیا مگر سو نہ سکا۔ واسودیو نے اسے ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی جو اس نے خود پہلے سے سوچی اور محسوس نہیں کی تھی۔ مگر سوچ سے زیادہ قوی اس بچے سے محبت، اس کی لگن اور اس سے بچھڑنے کا ڈر تھا۔ اس کا دل بھلا اس طرح کبھی کسی کے لئے تڑپا تھا؟ اس نے کبھی کسی سے اتنی محبت کی تھی، اس شدت سے، اندھے پن کی حد تک، اسے اتنی نراشا اور اتنے دکھ اور جس میں پھر بھی اتنی خوشی ملے؟

سدھارتھ اپنے دوست کے مشورے پر عمل نہ کر سکا، وہ اپنے بیٹے کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے بیٹے کو اس بات کی چھوٹ دے رکھی تھی کہ اس پر حکم چلائے اور گستاخی کرے۔ وہ خاموش رہتا اور انتظار کرتا، روزانہ وہی دوستی اور صبر کی اس گونگی جنگ کا آغاز کرتا۔ واسودیو بھی خاموش تھا اور منتظر تھا کہ وہ مہربان، سمجھ دار اور تحمل والا آدمی تھا۔ دونوں اپنے صبر میں کامل تھے۔

ایک دفعہ جب اسے اپنے بیٹے میں کملا کی شباہت محسوس ہوئی تھی تو سدھارتھ کو ایک بات کا خیال آیا تھا جو کملا نے بہت پہلے اس سے کہی تھی۔ ''تم محبت نہیں کر سکتے۔'' اس نے سدھارتھ سے کہا تھا اور سدھارتھ نے اس بات سے اتفاق کیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ستارے سے تشبیہ دی تھی اور دوسرے لوگوں کو گرتے پتوں سے، اور اسے کملا کی اس بات میں ہلکی سی ملامت محسوس ہوئی تھی۔ یہ تو سچ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو کسی دوسرے میں اس طرح گم نہیں کیا تھا کہ خود کو بھی بھول جائے؟ اس نے کسی دوسرے کی خاطر پریم کا مورکھ پن نہیں جھیلا تھا۔ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکا اور اس وقت اسے یہ محسوس ہوا تھا کہ اس میں اور دوسروں میں اہم ترین فرق یہی ہے۔ مگر جب سے اس کا بیٹا اس کے پاس تھا تو سدھارتھ بھی اپنے دکھ اور اپنی محبت کے ذریعے سے بالکل عام آدمی بن گیا تھا۔ وہ پاگل پن کی حد تک عشق میں گرفتار تھا، عشق کے عالم میں پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ اور بہت مدت کے بعد، زندگی میں پہلی دفعہ وہ اس عجیب ترین اور طاقتور ترین جذبے کی شدت سے گزر رہا تھا، وہ اس کی وجہ سے بے پناہ دکھ جھیل رہا تھا، پھر بھی اس کے سبب سے بلند ہوا جا رہا تھا، تازہ تر اور تو انا تر ہو رہا تھا۔

اسے واقعی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ بیٹے کے لئے یہ اندھی محبت بہت ہی انسانی جذبہ ہے، یہ بھی سنسار کا ایک حصہ تھی۔

گہرے پانی کا ایک جھرنا تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ بے کار نہیں ہے، یہ لازمی ہے، یہ اس کی اپنی فطرت سے پھوٹ رہی ہے۔ یہ جذبہ، یہ دکھ درد، یہ مورکھ پن ان سب کا بھی تجربہ اسے حاصل کرنا تھا۔

اور اس دوران اس کے بیٹے نے اسے کھلی چھٹی دے رکھی تھی کہ وہ ساری حماقتیں کرے، کوشش کر کے دیکھے اور اپنی طبیعت کی وجہ سے عاجز ہو۔ باپ میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو بیٹے کو دلکش معلوم ہو، کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے وہ ڈرے۔ یہ باپ تھا تو اچھا آدمی، نیک، شاید سادھو منش بھی اور شاید مقدس بھی۔۔۔ مگر ان میں سے ایسی کوئی بات نہ تھی جو اس کا دل جیت سکے۔ یہ بات جو اسے اس منحوس کٹیا میں ڈالے ہوئے تھا، اس سے وہ بے زار آ چکا تھا اور جب وہ اس کی گستاخی کا جواب بھی ہنس کر دیتا، ہر بدتمیزی کا جواب مہربانی، ہر شرارت کا جواب نیکی سے دیتا تو اسے یہ سب اس بڈھے لومڑ کی مکاری معلوم ہوتی۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتا کہ باپ اسے مارے، اس کے ساتھ بدسلوکی کرے۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب ننھے سدھارتھ نے وہ سب کچھ کہہ ڈالا جو اس کے من میں تھا اور کھلم کھلا اپنے باپ کے خلاف بول اٹھا۔ باپ نے اس سے کہا تھا کہ جا کر تنکے اکٹھے کر لاؤ۔ مگر وہ کٹیا سے باہر نہیں نکلا، وہیں سرکش بنا غصے کے عالم میں کھڑا رہا، زمین پر پیر پٹخنے لگا اور مٹھیاں بھینچ لیں اور باپ کے لئے اپنی نفرت اور حقارت اس کے منہ پر ظاہر کرنے لگا۔

''خود اکٹھے کرو اپنے تنکے۔'' وہ چیخا، اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ ''میں تمہارا نوکر نہیں ہوں۔ مجھے پتا ہے تم مجھے نہیں مارتے، تم میں ہمت نہیں ہے! پھر بھی تم مجھے مستقل سزا دیئے جا رہے ہو، اپنی پارسائی اور مروت سے مجھے شرمندہ کئے جا رہے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ میں تم جیسا بن جاؤں، اتنا ہی پارسا، نیک اور دانا، مگر صرف تم کو چڑانے کی خاطر میں چور اور خونی بننا اور نرک میں جانا پسند کروں گا، مگر تم سا ہرگز نہیں بنوں گا۔ مجھے نفرت ہے تم سے، تم میرے باپ نہیں ہو چاہے تم بیسیوں مرتبہ میری ماں کے یار رہ چکے ہو!''

غصے اور کوفت کے عالم میں اس نے اپنے باپ کے خلاف ان وحشی اور ناراض الفاظ میں اظہار کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔ پھر وہ وہاں سے بھاگ گیا اور بہت دیر بعد شام پڑے واپس آیا۔

اگلی صبح وہ غائب ہو گیا۔ چھال کی بنی ایک چھوٹی سی دورنگی ڈلیا بھی، جس میں دونوں مانجھی اپنی اجرت کے طور پر ملنے والے تانبے اور چاندی کے سکے جمع کرتے تھے۔ غائب تھی اور ان کی ناؤ کا بھی کوئی پتا نہ تھا۔ سدھارتھ نے دیکھا کہ ناؤ دوسرے کنارے پر نظر آ رہی ہے۔ اس کا بیٹا بھاگ نکلا تھا۔

''میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔'' سدھارتھ نے کہا۔ بیٹے کی سخت کلامی کے بعد سے وہ گزشتہ دن سے سخت اضطراب میں تھا۔ ''اس جنگل سے کوئی بالک اکیلا نہیں جا سکتا۔ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جائے گا۔ واسودیو، ہمیں لٹھوں کا بیڑا بنانا پڑے گا۔''

''ہم بیڑا بنائیں گے'' واسودیو نے کہا ''تاکہ ہم وہ کشتی وہاں سے لے آئیں جو تمہارا لڑکا لے گیا۔ مگر اسے جانے دو، میرے دوست، وہ اب بچہ نہیں ہے، اسے اپنے اچھے برے کی خبر ہے۔ وہ شہر کا راستہ ڈھونڈ رہا ہے اور وہ ٹھیک کر رہا ہے۔ یہ مت بھولو۔ وہ تو وہی کچھ کر رہا ہے جو تم نہ کر سکے۔ وہ آپ اپنی دیکھ ریکھ کر رہا ہے، اپنے راستے پر چل رہا ہے۔ ارے سدھارتھ، ارے سدھارتھ، مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم دکھی ہو، تم وہ دکھ جھیل رہے ہو جس پر ہنسی آتی ہے، جس پر تم خود ہنسنے لگو گے۔''

سدھارتھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے ہاتھ میں کلہاڑی اٹھالی اور لٹھوں کا بیڑا بنانے کے لئے بانس چیرنے لگا، اور واسودیو اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے بانس کے ڈنڈوں کو گھاس کی رسی سے باندھنے لگا۔ پھر وہ بیڑا پانی میں تیرایا گیا اور وہ اس پر دور نکل گئے اور بیڑے کو دھارے کے رخ پر لا کر دوسرے کنارے پر اتر آئے۔

''تم یہ کلہاڑی ساتھ کیوں لائے ہو؟'' سدھارتھ نے پوچھا۔

واسودیو نے کہا: ''ہو سکتا ہے ہماری ناؤ کے چپو کھو گئے ہوں۔''

مگر سدھارتھ کو معلوم تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔۔۔ شاید اس لڑکے نے چپو پھینک دیئے ہوں یا بدلہ لینے کو توڑ دیئے ہوں۔ اسلئے اور بھی کہ کوئی اس کا پیچھا نہ کر سکے۔ اور واقعی ناؤ سے چپو غائب تھے۔ واسودیو نے ناؤ کے پیندے کی طرف اشارہ کیا اور اپنے دوست کو دیکھ کر مسکرایا: دیکھ لیا تم نے تمہارا بیٹا کیا کہہ رہا ہے؟ دیکھ لیا تم نے کہ وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ کوئی اس کے پیچھے آئے؟ مگر واسودیو نے یہ بات شبدوں میں نہیں کہی اور نیا چپو بنانے لگا۔ سدھارتھ نے اس سے اجازت مانگی کہ لڑکے کو دیکھنے جائے۔ واسودیو نے اسے نہیں روکا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

باب نمبر15

سدھارتھ خاصی دیر سے جنگل میں گھوم رہا تھا کہ اسے خیال آیا کہ تلاش بے سود ہے۔ اس نے سوچا، یا تو لڑکا بہت پہلے ہی جنگل سے نکل گیا ہے اور شہر پہنچ چکا ہے، یا اگر اب بھی راستے میں ہے تو پیچھا کرنے والوں سے چھپ رہا ہے۔ پھر جب اس نے اور سوچا تو اسے معلوم ہوا کہ اسے اپنے بیٹے کی فکر نہیں تھیں، من ہی من میں اسے معلوم تھا کہ اسے نہ تو کوئی نقصان پہنچا ہے نہ اسے جنگل میں کوئی خطرہ درپیش ہے۔ پھر بھی وہ متواتر چلتا رہا۔ اپنے بیٹے کو بچانے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف اسی جذبے کی تحت کہ اسے دوبارہ دیکھے اور چلتے چلتے وہ شہر کی حدود تک پہنچ گیا۔

جب وہ شہر کے قریب بڑی سڑک پر آیا تو عیش باغ کے پھاٹک پر پہنچ کے رک گیا جو کبھی کملا کا تھا، جہاں اس نے پہلی مرتبہ کملا کو پالکی میں بیٹھے دیکھا تھا۔ ماضی کا سماں اس کی نگاہوں میں پھر گیا اس نے ایک مرتبہ پھر دیکھا کہ وہ وہاں کھڑا ہوا ہے، نوجوان، بڑے بڑے بالوں والا تباہ حال سنیاسی جس کے سر میں خاک دھول اٹی تھی۔ سدھارتھ بہت دیر تک وہاں کھڑا تھا اور کھل کے پھاٹک میں سے باغ کے اندر جھانکتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ ہرے بھرے درختوں کے نیچے بھکشو ٹہل رہے ہیں۔

وہ بہت دیر وہاں کھڑا رہا، سوچتا رہا، تصویریں دیکھتا رہا، اپنی جیون کتھا کو تصویر بنتے دیکھتا رہا۔ وہ بہت دیر وہاں کھڑا بھکشوؤں کو دیکھتا رہا، ان کی جگہ نوجوان سدھارتھ اور کملا کو لمبے لمبے پیڑوں کی چھاؤں میں ٹہلتے گھومتے دیکھتا رہا۔ اسے بالکل صاف نظر آ رہا تھا کہ کملا اس کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے اور اسے پہلا بوسہ دے رہی ہے۔ اس نے دیکھا کہ وہ اپنے سنیاس کو کس قدر گھمنڈ اور کتنی حقارت سے دیکھتا ہے، اور کس شوق اور تجسس سے اس نے اپنی دنیاوی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس نے کام سوامی کو دیکھا، وہ نوکر چاکر، وہ ضیافتیں، جوا کھیلنے والے، سازندے، سب کچھ۔ اس نے دیکھا کہ کملا کی چڑیا پنجرے میں بیٹھی ہے۔ وہ سارا کچھ اس نے اس لمحے دوبارہ جی کر دیکھا،، اس سنسار میں دوبارہ سانس لیا، بوڑھا ہوا اور تھک گیا، پھر اسے متلی ہوئی اور مر جانے کی خواہش ہونے لگی اور پھر سے اس نے اوم کا شبد سنا۔

جب وہ باغ کے دروازے پر کھڑا رہا تو سدھارتھ کو احساس ہوا کہ جو خواہش اسے یہاں اس جگہ لے کر آئی ہے وہ نادانی کے سوا کچھ نہیں، وہ اپنے بیٹے کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اسے اپنے آپ کو بیٹے پر مسلط نہیں کرنا چاہیے۔ اسے اپنے مغرور ضدی بیٹے کے لئے شدید چاہت کا احساس ہوا، سزخم کی طرح گہری محبت کا احساس، اور ساتھ ساتھ یہ احساس کہ یہ زخم اس کے اندر ہرا نہ رہے گا، بھر جائے گا۔

اور چوں کہ وہ زخم اس ایک لمحے میں نہیں بھر سکا تو وہ اداس ہو گیا۔ اس مقصد کے بجائے، جو اسے بیٹے کی جستجو میں یہاں لے آیا تھا، اب صرف اور صرف خلا تھا۔

وہ اداس ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے لگا کہ اس کے دل میں کوئی چیز مر رہی ہے، اسے کوئی خوشی، کوئی مقصد نظر نہیں آیا۔ وہ وہاں دل گرفتہ بیٹھا رہا اور اداس ہوتا رہا۔ اس نے دریا سے یہ سیکھا تھا: انتظار کرنا، صبر کرنا، سننا۔ وہ بیٹھ گیا اور خاک میں اٹی سڑک پر سننے لگا، اس دل کی آواز پر کان لگا دیئے جو دھیرے دھیرے اداس اداس دھڑکتا تھا اور آواز کا انتظار کرنے لگا۔ وہ وہاں کئی گھنٹوں تک اکڑوں بیٹھا رہا اور کان لگائے رہا، اسے پھر کچھ نظر نہ آیا۔ وہ خلاء میں گرتا رہا اور اس نے خلاء سے باہر راستہ ڈھونڈے بغیر اپنے آپکو اس میں ڈوبنے دیا۔ اور جب اس نے اپنے زخم کو گلتا ہوا محسوس کیا تو اوم کا شبد دہرایا، اپنے آپ کو اوم سے بھر لیا۔ باغ کے بھکشوؤں نے اسے دیکھا اور جب وہ وہاں کئی گھنٹے اکڑوں بیٹھا رہا اور اسکے سفید بالوں پر دھول جمنے لگی تو ایک بھکشو اس کے پاس آیا اور اسکے سامنے دو کیلے رکھ دیے۔ بوڑھے سدھارتھ نے اس بھکشو کو نہیں دیکھا۔

اپنے شانے پر ایک ہاتھ کے لمس نے اسے اس سکتے سے چونکا دیا۔ اس نے اس مہربان نرم لمس کو پہچان لیا اور ہوش میں آ گیا۔ وہ اٹھا اور واسودیو کو پرنام کیا اور جان لیا کہ واسودیو اس کے پیچھے چلا آیا۔ جب اس نے واسودیو کا شفیق چہرہ دیکھا، اسکی ہنسی کھلکھلاتی جھریوں پر، اسکی چمکتی آنکھوں پر نظر ڈالی تو خود بھی ہنس پڑا۔ اسے اپنے پاس پڑے ہوئے کیلے نظر آئے۔ اس نے وہ اٹھا لئے، ایک واسودیو کو دیا، ایک آپ کھا لیا۔ پھر وہ اپنے مانجھی کے ساتھ چلتا ہوا جنگل سے گزرتا ہوا ناؤ کے پاس لوٹ آیا۔ دونوں میں سے کسی نے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔ نہ اس لڑکے کا نام لیا نہ اسکے فرار کی بات کی نہ سدھارتھ کے زخم کا ذکر کیا۔ سدھارتھ کٹیا میں اپنے بچھونے پر جا لیٹا اور را دیر بعد جب واسودیو اس کے پاس گیا کہ اسے ناریل کا ڈاب پینے کیلئے دے تو اس نے دیکھا کہ سدھارتھ سو رہا ہے۔

اوم

بہت دنوں تک سدھارتھ کا زخم ہرا رہا۔ وہ بہت سے ایسے مسافروں کو دریا پار کراتا جن کے ساتھ بیٹا یا بیٹی ہوتی تو وہ ان کو دیکھ کر رشک کئے بنا نہیں رہ سکتا تھا، اور سوچتا: کتنے سارے لوگ ہیں جنہیں یہ خوشی میسر ہے۔ میں اس

سے کیوں محروم ہوں؟ بدکردار لوگ، چور، ڈاکوؤں کے بھی بال بچے ہوتے ہیں، وہ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں اور بچے بھی ان سے محبت کرتے ہیں، بس ایک میں ہوں۔ اب وہ اسی بچکانہ اور احمقانہ طریقے سے سوچتا تھا۔ اب وہ اس حد تک عام آدمیوں جیسا بن چکا تھا۔

اب وہ لوگوں کو پہلے کے مقابلے میں اور طرح سے دیکھنے لگا تھا کہ لوگ بہت زیادہ چالاک، بہت زیادہ پرغرور نہیں ہیں اس لئے اور بھی گرم جوش، متجسس اور ہمدرد ہوتے ہیں۔

جب وہ معمولی قسم کے مسافروں کو دریا پار کراتا، بیوپاری، سپاہی اور عورتیں، تو وہ اسے بے گانے نہ لگتے، جیسے پہلے لگا کرتے تھے۔ وہ ان کے خیالات اور نظریات کو سمجھ سکتا تھا نہ ان میں شریک ہوسکتا تھا مگر وہ ان کے ساتھ زندگی کی اُمنگوں اور خواہشات میں تو شریک تھا۔ حالانکہ وہ تہذیب نفس کے اعلیٰ درجات تک پہنچ چکا تھا اور اپنے اس تازہ زخم کو بھی سہ گیا تھا، اسے اب یوں لگتا تھا کہ یہ عام لوگ اس کے بھائی بند ہیں۔ ان کی نمود و نمائش، خواہشات اور چھوٹی چھوٹی باتیں اسے اب مضحکہ خیز نہیں معلوم ہوتیں، اسے وہ سب سمجھے جانے کے لائق، محبت کے لائق اور عزت کے قابل معلوم ہونے لگے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ بیٹے کے لئے ماں کی محبت اندھی ہوتی ہے، اکلوتے بیٹے پر باپ کا احمقانہ فخر اندھا ہوتا ہے، کپڑے گہنے اور چاہنے والوں کے لئے نوجوان عورت کی بے قرار ہوس اندھی ہوتی ہے۔ یہ سارے سیدھے سادے، احمقانہ، مگر بے انتہا طاقتور اور زندگی سے بھرپور جذبے اور امنگیں اور خواہشات سدھارتھ کو اب معمولی نہ لگتیں۔ اس نے دیکھا کہ لوگ ان کی خاطر جیتے ہیں اور بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں، سفر کرتے ہیں، جنگیں لڑتے ہیں، بے انتہا دکھ اٹھاتے ہیں اور جھیل جاتے ہیں، اور سدھارتھ کو لوگ اس لئے اچھے اور بھی پیارے لگے۔ اس نے ان کی خواہشات اور ضروریات میں زندگی، قوت، لافانی کیفیت اور برہما کو دیکھا۔ یہ لوگ اپنی اندھی وفاداری اور اپنی اندھی قوت کی وجہ سے محبت اور تعظیم کے لائق تھے۔ سوائے ایک چھوٹی سی چیز کے، اس ایک ننھی منی بات کہ جو مفکر میں اور دانش ور میں ہوتی ہے، اور وہ چیز ہے تمام عمر کی یکتائی کا شعور اور کئی دفعہ سدھارتھ کو شک ہوا کہ یہ علم، یہ خیال اتنا اہم ہے بھی کہ نہیں، کہیں یہ فلسفیوں کی بچکانہ خود توصیفی تو نہیں، کہ مفکر بھی تو آخر سوچنے والے بچے ہیں۔ دنیا کے لوگ ہر چیز میں مفکرین کے برابر تھے اور بعض دفعہ ان سے بہتر بھی، جیسے جانور بھی ضرورت کے تحت اپنی کٹر اور اٹل حرکات کی وجہ سے آدمیوں سے بہتر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ سدھارتھ کے من میں یہ علم دھیرے دھیرے پختہ ہونے لگا کہ دانائی ہوتی کیا ہے، اور یہی اس کی طویل جستجو کا ثمرہ تھا یہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ آتما کی ایک تیاری تھی، ایک سمرتھ تھا، سوچنے کا ایک خفیہ انداز، زندگی کے ہر سانس، ہر لمحے میں اس یکتائی کو محسوس کرنا اور اسی میں سانس لینا۔ یہ خیال دھیرے دھیرے اس کے اندر پختہ ہونے لگا، اور یہی خیال واسودیو کے بھولے بھالے بچوں جیسے چہرے پر دمکتا نظر آتا: نظم و ترتیب، دنیا کی ابدی تکمیل کا علم، اور یکتائی۔

مگر وہ زخم پھر بھی دکھتا تھا۔ سدھارتھ کا جی بیٹے کے لئے دھڑکتا، کڑھاجاتا، بیٹے محبت کا شعلہ آپ سے آپ نہیں بجھ جاتا۔

ایک دن جب زخم میں درد سوا ہوتا تھا، اس تمنا کا مارا سدھارتھ دریا پار ناؤ کھیتا ہوا گیا اور کنارے پر اترا کہ شہر جائے اور اپنے بیٹے کو ڈھونڈے۔ دریا دھیرے دھیرے نرم نرم بہتا تھا، سوکھے کا موسم تھا مگر دریا کی آواز صاف گونجتی تھی۔ دریا بڈھے مانجھی پر زور زور سے ہنستا تھا۔ سدھارتھ تھم گیا، وہ پانی پر جھکا کہ اچھی طرح سن لے۔ اس نے دیکھا کہ مدھم مدھم بہتے پانی پر اس کا چہرہ بن رہا ہے اور عکس کچھ اس طرح کا پڑ رہا ہے کہ اسے ایک بات یاد آ گئی جو وہ بھول گیا تھا اور جب غور کیا تو وہ بھولی بسری بات یاد آ گئی۔ اس کے چہرے میں ایک چہرہ اور تھا، اس شخص کا چہرہ، جس کو کسی زمانے میں وہ جانتا تھا، جس سے محبت کرتا تھا اور جس سے ڈرتا تھا، وہ چہرہ اس کے برہمن باپ کا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ نوجوان تھا تو اس نے کس طرح اپنے باپ کو مجبور کیا تھا کہ اسے جانے دے اور سنیاسیوں میں شامل ہونے دے، کس طرح وہ اس سے رخصت ہوا تھا، کس طرح وہ وہاں سے چلا آیا تھا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں گیا تھا۔ کیا اس کے باپ کو وہی دکھ نہیں ہوا ہوگا جو اب وہ اپنے بیٹے کے لئے محسوس کر رہا ہے؟ کیا اس کا باپ بھی اپنے بیٹے کو دیکھے بنا اکیلا مر نہیں گیا تھا؟ کیا اسے خود بھی اسی کی توقع نہیں رکھنا چاہیے؟ کیا یہ ناٹک نہ تھا، ایک عجیب اور احمقانہ کھیل، یہ سارا چکر بدشگونی کے دائرے میں واقعات کا سلسلہ؟

دریا ہنسا، ہاں، یہ تو تھا۔ ہر وہ چیز جسے آخر تک جھیل کر انجام کو نہیں پہنچایا جاتا، وہ خود کو دہراتی ہے اور وہی دکھ دوبارہ جھیلنے پڑتے ہیں۔ سدھارتھ پھر ناؤ میں بیٹھ گیا اور اسے کھیتا ہوا کٹیا میں لوٹ آیا، اپنے باپ کے بارے میں سوچتا ہوا، اپنے بیٹے کے بارے میں سوچتا ہوا، دریا سے اپنی ہنسی اڑواتے ہوئے، اپنے آپ سے برسر پیکار، نراش کی انتہا کو پہنچا ہوا اور پھر بھی اپنے آپ پر اور پوری دنیا پر ہنسنے کے لئے تیار۔ یہ زخم اب بھی دکھتا تھا، وہ اب بھی اپنی تقدیر سے باغی تھا۔ اب بھی اس کو شانتی حاصل نہ ہوئی تھی نہ اس دکھ پر فتح ملی تھی۔ مگر وہ اب بھی آس لگائے ہوئے

تھا اور جب وہ کٹیا کو واپس لوٹا تو اس کا بے اختیار جی چاہا کہ واسودیو کے سامنے دل کھول کر رکھ دے، ہر بات کہہ ڈالے، اس کو سب کچھ بتا دے کہ وہ شخص سننے کا فن جانتا تھا۔ واسودیو کٹیا میں بیٹھا ٹوکری بن رہا تھا۔ وہ اب ناؤ نہیں چلاتا تھا کہ اس کی نگاہ کمزور ہوگئی تھی اور اس کے ہاتھ پیروں میں طاقت نہیں رہی تھی، بس کوئی فرق نہیں پڑا تھا تو اس کی سرخوشی اور اطمینان اور چہرے کے نور میں۔

سدھارتھ اس کے پاس بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے بولنے لگا۔ اس نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جس کا پہلے ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ کس طرح شہر گیا تھا اور اسکے زخم دکھتے تھے اور نصیبوں والے باپوں کو دیکھ کر وہ حسد سے بل اٹھتا تھا اور کس طرح اسے ان جذبوں کی نادانی کا احساس تھا اور وہ اپنے آپ سے ایک بے آسرا کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نے ہر چیز کا ذکر کیا، ہر بات بتا دی، وہ باتیں بھی جن کے سوچنے سے دکھ ہوتا تھا، وہ اسے ہر بات بتا سکتا تھا۔ اس نے واسودیو کو اپنے گھاؤ دکھا دیئے، واسودیو کو اس دن کے بارے میں بتایا کہ وہ کس طرح بھاگا تھا، اور دریا پار ناؤ چلاتا گیا تھا کہ بیٹے کو ڈھونڈنے شہر جائے اور کس طرح دریا ہنستا تھا۔

اور وہ کہتا رہا اور واسودیو مطمئن چہرہ لئے سنتا رہا تو سدھارتھ کو پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ واسودیو کو دلکشی کا احساس ہوا۔ اسے یوں لگا کہ اس کے سارے دکھ درد، ساری کٹھنائیاں اور من میں چھپی کامنائیں اڑ اڑ کر اس تک جاتی ہیں اور پھر پلٹ آتی ہیں۔ اس سننے والے شخص کو اپنا زخم دکھانا یوں تھا جیسے اس زخم کو دریا میں نہلانا کہ اس میں ٹھنڈک پڑ جائے اور وہ دریا میں بہہ جائے۔ بولتے بولتے اور سناتے سناتے سدھارتھ کو یہ احساس ہوتا جا رہا تھا کہ یہ اب واسودیو نہ رہا تھا، اس کی بات سننے والا کوئی آدمی نہ تھا۔ اسے یوں لگا کہ یہ بے حس و حرکت سامع جو اس کے اعترافات کو یوں اپنے آپ میں جذب کر رہا ہے جیسے پیڑ بارش کو پی لیتے ہیں، یہ بے حس و حرکت آدمی ہی دریا تھا، دیوتا تھا، ابدالاباد تھا۔ سدھارتھ نے اپنے اور اپنے زخم کے بارے میں سوچنا بند کر دیا اور واسودیو کی یہ کایا کلپ اس کو پکڑنے لگی، اور جوں جوں اس کو یہ احساس ہوتا جاتا، وہ اس سے مانوس ہوتا جاتا، اور یہ احساس بڑھتا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ عین فطری ہے اور واسودیو بہت پہلے سے، شروع سے، ہمیشہ سے ایسا ہی تھا مگر سدھارتھ اسے پہچان نہ پایا تھا، بلکہ وہ خود بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ واسودیو کو اس طرح سمجھتا ہے جیسے لوگ دیوتاؤں کو سمجھتے ہیں اور یہ کیفیت زیادہ عرصہ ساتھ نہ دے گی۔ من ہی من میں وہ واسودیو سے بچھڑنے لگا تھا۔ اور اس دوران وہ بولتا رہا۔

جب وہ کہہ چکا تو واسودیو نے اپنا ناتواں چہرہ اس کی جانب پھیر لیا۔ وہ کچھ نہیں بولا مگر اس کے چہرے سے خاموشی کے ساتھ محبت اور اطمینان اور سمجھ بوجھ اور دانائی کا نور پھوٹنے لگا۔ اس نے سدھارتھ کا ہاتھ تھام لیا، اسے دریا کنارے لے گیا، اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور دریا کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''تم نے اسے ہنستے ہوئے سنا ہے'' وہ بولا، ''مگر تم نے ساری آوازیں نہیں سنیں۔ آؤ ہم سنیں۔ آؤ ہم اور سنیں۔''

وہ سننے لگے۔ کئی آوازوں والا دریا مدھم مدھم گونجنے لگا۔ سدھارتھ نے دریا میں جھانکا اور دیکھا کہ بہت سی تصویریں اس میں بہتی چلی جا رہی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اکیلا بیٹھا اپنے بچھڑے بیٹے کو رو رہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو دیکھا، اتنا ہی اکیلا اور اسی طرح اپنے دور دراز بیٹے کی محبت کی زنجیروں میں بندھا ہوا، اس نے اپنے بیٹے کو بھی دیکھا، وہ بھی اکیلا تھا اور تیز تیز پگ دھرتا جیون مایا کے جلتے راستوں پر چلا جاتا تھا، ہر ایک اپنی منزل کی جانب رواں تھا، اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا، ہر ایک دکھی تھا۔ دریا کی آواز میں بھی دکھ تھا۔ وہ اداسی اور حسرت میں گنگناتا تھا اور اپنے سمندر کی جانب بہا جاتا تھا۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر16

''سن رہے ہو؟'' واسودیو کی خاموش نگاہوں نے پوچھا۔ سدھارتھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور سنو!'' واسودیو نے سرگوشی کی۔

سدھارتھ نے کان لگا دیئے۔ اس کے باپ کی تصویر، اس کی اپنی تصویر، اور اس کے بیٹے کی تصویر، تینوں تصویریں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں۔ کملا کی تصویر بھی ابھری اور دور ہو گئی، اور گووند کی تصویر اور دوسری تصویریں ابھریں اور ڈوب گئیں۔ ساری تصویریں دریا کا حصہ بن گئیں۔ یہی ان کا مقصد تھا، یہی حسرت، آرزو، دکھ۔ اور دریا کی آواز بھی حسرت سے بھرپور تھی، دکھ سے بھرپور، نہ مٹنے والی آرزوؤں سے بھرپور۔ دریا اپنی منزل کی طرف بہتا جاتا تھا۔ سدھارتھ نے دیکھا کہ دریا جلدی جلدی بھاگ رہا ہے، اور اس کے باہو میں وہ خود بھی ہے اور اس کے رشتے دار اور وہ سارے لوگ جنہیں اس نے دیکھا تھا۔ موجیں اٹھتی تھیں، دریا کا پانی جلدی جلدی بھاگ رہا تھا، دکھ اٹھاتا، جلدی مچاتا اپنی منزل کی جانب، بہت سی منازل کی جانب کہ ہر منزل کی جگہ ایک دوسری منزل لے لیتی۔ پانی بھاپ بنتا اور اوپر اٹھتا، بارش بنتا، نیچے آن گرتا، جھرنا بنتا، ندی بنتا، دریا بن جاتا، پھر سے نیا روپ بھرتا اور نیا ہو کر بہنے لگتا۔ مگر یہ حسرت بھری آواز بدل گئی تھی۔ اس میں اب بھی دکھ اور جستجو گونجتی، مگر اس میں اب اور آوازیں شامل ہو گئی تھیں: خوشی کی آوازیں اور غم کی آوازیں، اچھی اور بری آوازیں، ہنستی اور روتی آوازیں، ہزاروں آوازیں۔

سدھارتھ سنتا رہا۔ وہ اب بہت توجہ سے سن رہا تھا، اس میں بالکل ڈوبا ہوا تھا اور من کو بالکل خالی کر کے ایک ایک بات من میں اتار رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب اس نے سننے کا فن پوری طرح سیکھ لیا ہے۔ اس نے یہ سب پہلے سنا تھا، دریا کی یہ ساری آوازیں، مگر آج اس کی آواز ہی اور تھی۔ وہ ان آوازوں میں تفریق نہیں کر سکتا تھا کہ ہنستی آواز کون سی ہے اور روتی کون سی، بچکانہ آواز کون سی ہے اور مردانہ کون سی۔ وہ سب آوازیں ایک دوسرے کی تھیں: حسرت ناک نوحہ۔ داناؤں کی ہنسی۔ غصے کی چیخ اور مرنے والے کی آخری ہچکی۔ یہ سب آپس میں جڑی ہوئی اور بندھی ہوئی تھیں، ہزاروں طرح سے گھلی ملی ہوئی تھیں۔ اور ساری آوازیں، ساری منزلیں، ساری حسرتیں۔ سارے دکھ، سارے سکھ، سب نیکیاں اور برائیاں، یہ سب کے سب مل کر ہی دنیا تھے۔ یہ سب مل کر واقعات کا بہاؤ، جیون دھارا اور جیون راگ تھے۔ جب سدھارتھ نے غور سے دریا کو سنا تو اسے یہ ہزار گیت والی راگنی سنائی دی۔ جب وہ کسی ایک دکھ یا ایک قہقہے کو نہیں سن رہا تھا، جب وہ اپنی آتما کو کسی ایک مخصوص آواز سے باندھ کر اسے اپنی ذات میں جذب نہیں کر رہا تھا، بلکہ ان سب کو سنتا، یہ کل یکتائی، تب پھر ہزار گیتوں والی یہ وشال راگنی ایک ہی شبد تھی: اوم۔۔۔ تکمیل۔۔۔

''سنتے ہو؟'' واسودیو کی نظروں نے پھر پوچھا۔

واسودیو کی مسکراہٹ پر نور تھی، اس کی ساری جھریوں پر چمکتی ہوئی منڈلاتی تھی جس طرح اوم دریا کی ساری آوازوں پر منڈلاتا تھا۔ جب وہ اپنے دوست کی طرف دیکھ رہا تھا تو اس کی مسکراہٹ میں نور بھرا تھا اور اب وہی مسکراہٹ سدھارتھ کے چہرے پر بھی پھوٹنے لگی۔۔۔۔ اب اس کا زخم بھرنے لگا، اس کا غم چھٹنے لگا، اس کی ذات اس یکتائی میں مدغم ہو گئی تھی۔

اس گھڑی سے سدھارتھ نے اپنی تقدیر سے لڑنا بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر علم کا اطمینان دمکتا، اس شخص کا اطمینان جو خواہشات کے تصادم کا شکار نہیں ہے۔ جسے مکتی مل گئی ہے، جو واقعات کے بہاؤ، جیون دھارا سے ہم آہنگ ہے، جو دردمندی اور مہربانی سے بھر گیا ہے، جس نے اپنے آپ کو اس بہاؤ پر چھوڑ دیا ہے اور اب تمام اشیاء کی یکتائی میں شامل ہو گیا ہے۔

جب واسودیو دریا کنارے اپنی جگہ سے اٹھا۔ جب اس نے سدھارتھ کی آنکھوں میں جھانکا اور ان میں عالمانہ اطمینان کو چمکتے دیکھا تو اس کے کندھے کو اپنے خاص مہربان اور محافظانہ انداز میں ہولے سے چھوا اور بولا: ''میں اس لمحے کا منتظر تھا، میرے دوست، اب وقت آ گیا ہے کہ مجھے جانے دو۔ میں بہت دنوں تک ناؤ کا مانجھی واسودیو بنا رہا۔۔۔۔ اب اس کا کیا ہوا۔ کٹیا کو الوداع، دریا کو الوداع اور سدھارتھ کو الوداع۔''

سدھارتھ اس جانے والے کے آگے جھک گیا۔

''مجھے معلوم تھا۔'' اس نے کہا۔ ''تم جنگل میں جا رہے ہو؟''

''ہاں، میں جنگل میں جا رہا ہوں، میں تمام اشیاء کی یکتائی میں جا رہا ہوں۔'' چمکتے دمکتے نور برساتے واسودیو نے کہا۔

تو یوں وہ چلا گیا۔ سدھارتھ اسے دیکھتا رہا، بہت مسرت اور متانت سے وہ اسے دیکھتا رہا کہ اس کا پگ پگ شانت ہے، چہرہ دمکتا ہے، پیکر روشن ہے۔

گووند

گووند نے ایک مرتبہ کچھ بھکشوؤں کے ساتھ اس باغ میں آرام کیا جو کملا کنچنی نے گوتم کے چیلوں کو دے ڈالا تھا۔ وہاں اس نے ذکر سنا کہ دریا کنارے ایک مانجھی رہتا ہے۔ یہاں سے دن بھر کی مسافت پر جس کو بہت سے لوگ رشی کہتے ہیں۔ جب گووند سفر پر چلا تو اسی راستے پر ہولیا کہ وہ اس مانجھی کو دیکھنے کا مشتاق تھا، اس لئے کہ گو اس کا جیون دھرم کے مطابق تھا اور نوعمر بھکشوؤں کے حلقے میں وہ اپنی عمر اور مرتبے سے عزت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا، مگر اس کا من اب بھی بے چین تھا اور اس کی جستجو ناآسودہ تھی۔

وہ دریا کے پاس پہنچا اور بوڑھے سے کہا کہ اسے دریا پار لے جائے۔ جب وہ دوسرے کنارے پہنچ کر ناؤ سے اترنے لگے تو گووند نے بوڑھے سے کہا: ''تم بھکشوؤں اور یاتریوں کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے ہو اور انہیں پار لے جاتے ہو۔ کیا تم بھی راہ حق کے متلاشی ہو''؟

بوڑھے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''اے محترم، کیا تم بھی اپنے آپ کو متلاشی کہتے ہو، تم جو عمر رسیدہ ہو گئے ہو گوتم کے چیلوں کے بھیس میں ہو؟''

''ہاں میں بوڑھا ہو گیا ہوں'' گووند نے کہا ''مگر میں نے جستجو نہیں چھوڑی۔ میں جستجو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ یہی میری تقدیر ہے۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ تم نے بھی یہ جستجو کی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ گے، دوست؟''

سدھارتھ نے کہا: ''میں تمہیں کام کی کیا بات بتا سکتا ہوں، سوائے اس کے کہ تم شاید ڈھونڈتے بہت ہو اور اپنی جستجو کی وجہ سے کچھ پا نہیں سکتے۔''

''وہ کس طرح؟'' گووند نے پوچھا۔

''جب کوئی آدمی ڈھونڈتا ہے'' سدھارتھ نے کہا ''تو ہوتا یہ ہے کہ اسے وہی چیز نظر آتی ہے جس کی اسے تلاش ہوتی ہے، وہ کوئی چیز نہ پا سکتا ہے نہ اپنے آپ میں جذب کر سکتا ہے، اس لئے کہ اس کے سامنے ایک ہی مقصد ہے، اس لئے کہ اس پر ایک منزل کی دھن سوار ہے۔ جستجو کے معنی ہیں ایک مقصد، مگر پا لینے سے مراد ہے آزاد ہونا اور نئی چیزیں قبول کرنے کے قابل ہونا، کسی مقصد کا پابند نہ ہونا۔ تو اے محترم تم شاید واقعی متلاشی ہو، کیونکہ اپنے مقصد کی تلاش میں تم بہت سی ایسی چیزوں کو نہیں دیکھ پاتے جو بالکل تمہاری ناک کے نیچے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' گووند نے کہا۔ ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

سدھارتھ بولا: ''ایک دفعہ، اے محترم، بہت سال پہلے تم اس دریا کے پاس آئے تھے اور تمہیں یہاں ایک آدمی سوتا ہوا ملا۔ تم اس کے پاس بیٹھ گئے کہ جب تک وہ سوتا رہے تم اس کی حفاظت کرو مگر تم نے سونے والے آدمی کو نہیں پہچانا، گووند۔''

گووند بھکشو حیرت زدہ اور مسحور ہو کر مانجھی سدھارتھ کو دیکھتا رہا۔

''تم سدھارتھ ہو؟'' اس نے جھینپتے ہوئے پوچھا۔ ''میں تمہیں اس مرتبہ بھی نہیں پہچان سکا۔ تمہیں پھر سے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، سدھارتھ، بہت خوشی ہوئی تم بہت بدل گئے ہو میرے دوست۔ اور کیا تم بھی مانجھی بن گئے ہو؟''

سدھارتھ ہنس پڑا۔ ''ہاں میں بھی مانجھی بن گیا ہوں۔ بعض لوگوں کو بہت بدلنا پڑتا ہے اور طرح طرح کے بھیس بھرنے پڑتے ہیں۔ میرے دوست، میں بھی انہی میں سے ہوں۔ مگر میں تمہارا سواگت کرتا ہوں، گووند، اور تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم ایک رات میری کٹیا میں گزارو۔''

گووند رات کو اس کٹیا میں رہا، اور اس بستر پر سویا جو کبھی واسودیو کا تھا۔ وہ اپنے پرانے دوست سے بہت سارے سوال پوچھتا رہا اور سدھارتھ کے پاس اسے اپنی زندگی کے بارے میں بتانے کے لئے بہت کچھ تھا۔

جب اگلی صبح گووند کے جانے کا وقت ہو گیا تو اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے پوچھا: ''اس سے پہلے کہ میں اپنی راہ لگوں، میں تم سے ایک سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں، سدھارتھ۔ تمہارا کوئی عقیدہ، نظریہ یا علم ہے جس کی تم پیروی کرتے ہو، جو تمہیں زندگی گزارنے اور نیکی کرنے میں مدد دیتا ہے؟''

سدھارتھ کہنے لگا: ''تم تو جانتے ہو میرے دوست کہ نوجوانی میں جب ہم سنیاسیوں کے ساتھ جنگل میں رہتے تھے تو میں نظریات اور اساتذہ سے مایوس ہو گیا تھا اور ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ میرے سوچنے کا انداز اب بھی وہی ہے حالانکہ جب سے لے کر اب تک مجھے بہت سے استاد ملے۔ ایک سندر کنچنی بہت دنوں تک میری گرو رہی، پھر ایک بیوپاری تھا، اور ایک جواری تھا۔ اور ایک دفعہ گوتم بدھ کے بھکشوؤں میں سے ایک میرا استاد بنا میں سو رہا تھا اور وہ یاتر اپر جاتے جاتے میرے پاس آن بیٹھا۔ میں نے اس سے سیکھا اور میں اس کا شکر گزار ہوں۔ بہت شکر گزار۔ مگر سب سے زیادہ میں نے اس دریا سے، اور یہاں اپنے پیش رو واسودیو سے سیکھا۔ وہ سیدھا سادھا آدمی تھا، سوچنے والا نہیں تھا، مگر وہ زندگی کے اصل جوہر تک اسی طرح پہنچ گیا گوتم بدھ پہنچا تھا۔ وہ بہت نیک آدمی تھا، مقدس تھا اور منی تھا۔''

گووند بولا: ''سدھارتھ، مجھے لگتا ہے مذاق کرنے کی تمہاری عادت ابھی گئی نہیں۔ میں تمہاری بات پر یقین کیے لیتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ تم نے کسی استاد کی پیروی نہیں کی، مگر کیا ایسا نہیں ہے کہ تمہارے اپنے بھی نظریات نہیں تو خیالات ضرور ہیں؟ تم نے کیا میں وہ علم دریافت نہیں کیا جس نے زندہ رہنے میں تمہاری مدد کی؟ اگر تم کچھ اس کے بارے میں بتا سکو تو مجھے بڑی بڑی خوشی ہوگی۔''

سدھارتھ نے کہا: ''ہاں میرے لئے سیدھے خیالات اور معلومات ضرور ہیں۔ کبھی ایسا ہوا کہ ایک گھنٹے کے لئے، یا دن بھر کے لئے مجھے علم بھی حاصل ہوا، جیسے آدمی اپنے دل میں زندگی کو محسوس کرتا ہے۔ میرے بہت سے خیالات رہے ہیں مگر تمہیں ان کے بارے میں بتانا بہت مشکل ہوگا۔ مگر ایک خیال ایسا ہے جس کا میرے دل پر گہرا اثر ہے۔ اور گووند وہ یہ ہے کہ دانائی سکھائی نہیں جا سکتی۔ وہ دانائی جو آدمی کسی کو سکھانا چاہے وہ حماقت لگتی ہے۔''

''تم مذاق کر رہے ہو!'' گووند نے کہا۔

نہیں، میں تمہیں وہی بتا رہا ہوں جو میں نے دریافت کیا ہے۔ علم تو سیکھایا جا سکتا ہے، مگر دانائی سکھائی پڑھائی نہیں جا سکتی۔ آپ اس کی جستجو کر سکتے ہیں، اسے پا سکتے ہیں، اسے جی سکتے ہیں، اس سے قوت حاصل کر سکتے ہیں، اس کے ذریعے سے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں، مگر آپ یہ دانائی کسی کو سکھا نہیں سکتے، کسی کو بتا نہیں سکتے۔ اس بات کا شک تو مجھے اس وقت بھی تھا جب میں نوجوان تھا اور یہی چیز تھی جو مجھے استادوں سے دور بھگاتی تھی۔ ایک خیال اور ہے میرا، جسے بھی تم مذاق اور نادانی سمجھو گے، اور وہ یہ کہ ہر سچ کے اندر اس کا الٹ بھی اتنا ہی سچا ہوتا ہے۔ مثلاً ایک سچائی کو الفاظ میں اسی وقت سمیٹا اور ظاہر کیا جا سکتا ہے جب وہ یک طرفہ ہو۔ ہر وہ بات جو سوچی جاتی ہے اور الفاظ میں ظاہر کی جاتی ہے یک طرفہ ہے، ادھورا سچ ہے۔ اس میں کلیت، یکتائی اور تکمیل کی کمی ہے۔ جب تتھاگت بدھ نے دنیا کے بارے میں سکھلایا تو اسے دو حصے کرنے پڑے، سنسار اور نروان، مایا اور سچ، دکھ اور مکتی۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے اور جو لوگ سکھاتے پڑھاتے ہیں ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں ہے۔ مگر دنیا جو ہمارے اندر باہر، اردگرد ہوتی ہے وہ کبھی

یک طرفہ نہیں ہوتی۔ کوئی بھی آدمی یا کوئی کام مکمل طور پر سنسار یا مکمل طور پر نروان نہیں ہوتا، نہ کوئی آدمی پورے کا پورا رشی منی ہوتا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے، اور وہ اس لئے کہ ہم اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ وقت ہی اصلی چیز ہے۔ وقت حقیقت نہیں ہے، گووند، مجھے یہ احساس بار بار ہوا ہے۔ اور اگر وقت حقیقی نہیں ہے تو وہ لکیر جو اس دنیا کو اور ابدالاباد کو، دکھ اور مکتی کو، اچھے اور برے کو الگ کرتی ہے، وہ بھی دھوکہ ہے، مایا ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' گووند نے حیران ہو کر پوچھا۔

''سنو، میرے دوست، میں بھی پاپی ہوں اور تم نے بھی پاپ کیے ہیں مگر کسی دن یہ پاپی بھی برہما بن جائیں گے، کسی دن نروان حاصل کر لیں گے، کسی دن بدھ بن جائیں گے۔ اور یہ کسی دن، بھی مایا ہے، یہ محض ایک تشبیہ ہے۔ کوئی پاپی بدھ بننے تو نہیں جا رہا، وہ ترقی تو نہیں کر رہا حالانکہ ہمارے خیال میں اس کے سوا کوئی اور گمان نہیں آ سکتا۔ نہیں، پاپی کے اندر بھی ایک ممکنہ بدھ موجود ہوتا ہے، اس کا مستقبل پہلے سے وہیں ہے۔ اس میں چھپے ہوئے اور ممکنہ بدھ کو پہچاننا چاہیے، اس میں، تم میں، ہر ایک میں۔ گووند، یہ دنیا نہ تو نامکمل ہے، نہ تکمیل پر پہنچنے کے لئے کسی طویل راستے پر ارتقاء پذیر ہے۔ نہیں یہ تو ہر لمحے مکمل ہے، ہر گناہ پہلے سے اپنے اندر بخشش اور رحمت لئے ہوئے ہے، سارے بچے ممکنہ بوڑھے ہیں، سارے دودھ پیتے بچے اپنے اندر موت لئے ہوئے ہیں اور سارے مردے حیات ابدی کے حامل ہیں۔ ایک آدمی کے لئے یہ دیکھنا ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا کہاں تک پہنچا ہے، چور اور جواری میں بھی بدھ موجود ہیں اور برہمن کے من میں بھی چور ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ گیان دھیان میں وقت کا اثر زائل ہو جائے اور ایک ہی وقت میں ماضی، حال، مستقبل میں جھانکا جا سکے، پھر ہر چیز اچھی ہے، ہر چیز مکمل ہے، ہر چیز برہما ہے۔ لہٰذا مجھے تو یہ لگتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ اچھا ہے۔۔۔۔ زندگی بھی اور موت بھی، پوتر تا بھی اور پاپ بھی، دانائی بھی اور نادانی بھی، ہر چیز لازمی ہے، ہر چیز کو صرف اثبات چاہیے، میری توثیق اور میری محبت بھری سمجھ بوجھ، پھر میرے ساتھ سب ٹھیک ہے، اور کوئی چیز میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے اپنے جسم و جان کے ذریعے سے یہ سوچا کہ میرے لئے یہ لازمی تھا کہ میں پاپ کروں، مجھے لوبھ چاہیے تھا، مجھے جائیداد و ملکیت کی جدوجہد کرنا تھی اور متلی اور گھن کا تجربہ حاصل کرنا تھا اور نراش کے پاتال میں گرنا تھا تاکہ میں یہ سبق حاصل کر سکوں کہ مجھے ان کے خلاف مزاحمت نہیں کرنا ہے تاکہ میں دنیا سے پیار کر سکوں اور پھر اس کا خواہشوں کی کسی تخیلاتی دنیا سے مقابلہ نہ کروں، اسی سے پیار کروں اور اس بات پر فخر کروں کہ میں زمین زاد ہوں۔ تو، گووند، یہ ہیں وہ خیالات جو میرے من میں آتے ہیں۔''

پھر سدھارتھ جھکا، زمین سے پتھر اٹھایا اور اسے ہاتھ میں تھام لیا۔

اس نے پتھر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''یہ پتھر ہے اور وقت کی ایک مدت گزرنے پر شاید مٹی ہو جائے اور مٹی سے

شاید پودا بن جائے، جانور یا آدمی بن جائے۔ پہلے جیسی بات ہوتی تو میں کہتا: پتھر تو بس پتھر ہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں، یہ بھی دھوکہ ہے، مگر آوا گون میں یہ آدمی بن سکتا ہے، جان دار ہوسکتا ہے، تو اس کی بھی اہمیت ہے۔ تب میں نے یوں سوچا ہوتا۔ مگر اب میں سوچتا ہوں: پتھر تو پتھر ہے، یہ جانور بھی ہے، دیوتا بھی اور بدھ بھی۔ میں اس کی عزت اور اس سے محبت اس لئے نہیں کرتا کہ یہ کچھ ہے اور کچھ اور بن جائے گا، بلکہ اس لئے کہ یہ مدتوں سے سب کچھ ہے اور یہ ہمیشہ سب کچھ ہوتا ہے۔ میں اس لئے اس سے محبت کرتا ہوں کہ یہ پتھر ہے، اس لئے آج اور ابھی یہ مجھے پتھر نظر آ رہا ہے۔ مجھے اس کے ننھے منے گڑھوں اور اس پر پڑے باریک نشانات، اس کے زرد اور سرمئی رنگوں اور اس کی سختی اور اس کو ٹکرانے پر آتی آواز، اس کی سطح کی خشکی یا نمی، ہر چیز میں بہت معنویت اور اہمیت نظر آ رہی ہے۔ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جو تیل یا صابن معلوم ہوتے ہیں، بعض تو پتے اور پیڑ معلوم ہوتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک الگ ہوتا ہے۔ اور اپنے الگ ڈھنگ سے اوم کا شبہ کہتا ہے ان میں سے ہر ایک برہما ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ پتھر بھی ہے، چکنا، صابن جیسا، اور یہی بات مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور بہت اعلیٰ اور پوجا کرنے کے لائق۔ مگر میں اس کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ شبد سوچ کو پوری طرح ظاہر نہیں کر سکتے۔ اظہار ہوتے ہی وہ تھوڑے سے الگ ہو جاتے ہیں، تھوڑے سے مسخ، تھوڑے سے احمقانہ۔ پھر بھی مجھے یہ اچھا لگتا ہے، اور یہ ٹھیک ہے کہ آدمی کے لئے جو چیز اچھی ہے اور اہم ہے اور دانائی رکھتی ہے وہ دوسرے کے لئے احمقانہ ہو۔''

گووند خاموشی سے سنے جا رہا تھا۔

ذرا دیر بعد اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا: ''تم نے مجھے پتھر کے بارے میں کیوں بتایا؟''

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

سدھارتھ
ہرمن ہیسے
مترجم: آصف فرخی

قسط نمبر17

''میں نے نا دانستہ یہ کیا۔مگر شاید اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے محبت ہے پتھر سے اور دریا سے اور ان ساری چیزوں سے جو ہم دیکھتے ہیں اور جن سے سیکھتے ہیں۔ گووند میں پتھر سے محبت کرسکتا ہوں اور پیڑوں سے اور چھال کے ایک ٹکڑے سے پیار کرسکتا ہوں۔ یہ سب چیزیں ہیں اور آدمی چیزوں سے پیار کرسکتا ہے۔مگر الفاظ سے محبت نہیں کی جاسکتی۔لہٰذا سکھشا میرے لئے بے کار ہے،ان میں نہ سنگینی ہوتی ہے نہ نرمی، نہ رنگ، نہ کھردرے کونے، نہ بو، نہ مزہ۔۔۔۔ان میں الفاظ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔شاید یہی وجہ ہے جو تمہیں شانتی نہیں حاصل ہوتی،شاید مکتی اور نیکی کے لئے بھی بہت الفاظ ہیں۔سنسار اور نروان بھی محض لفظ ہیں، گووند، نروان کوئی چیز نہیں ہے، بس ایک لفظ ہے نروان۔''

گووند نے کہا:''نروان محض ایک لفظ نہیں،میرے دوست،نروان خیال بھی ہے۔''

سدھارتھ کہتا رہا:''نروان خیال بھی ہوسکتا ہے مگر میرے دوست مجھے اعتراف ہے کہ میں خیالات اور الفاظ میں زیادہ فرق نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خیالات کو بھی زیادہ اہم نہیں سمجھتا۔مثلاً ناؤ پر ایک آدمی ہوا کرتا تھا جو میرا پیش رو اور میرا گرو تھا۔وہ ایسا منی تھا جو بہت برسوں تک دریا کو دھرم سمجھتا رہا اور دریا کے سوا کسی کی بھگتی نہیں کی۔ اس نے دیکھا کہ دریا کی آواز اس سے کچھ کہتی ہے۔اس نے اس سے سیکھا۔اس آواز نے اسے پڑھایا، اسے سکھشا دی۔دریا اسے دیوتا سمان ہوتا اور بہت برسوں تک اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ہوا کا ہر جھونکا، ہر بادل، ہر چڑیا، ہر کیڑا بھی اتنا ہی الوہی ہوتا ہے اور اتنا ہی جانتا ہے اور سکھشا سکھاتا ہے جتنا کہ دریا جانتا ہے اور سکھا سکتا ہے۔ مگر جب وہ جنگل میں لوٹ گیا تو اسے سب معلوم تھا، اسے مجھ سے اور تم سے زیادہ معلوم تھا،بغیر کسی گرو کے،بغیر کتابوں کے، کیونکہ وہ دریا کو دھرم سمجھتا تھا۔''

گووند نے کہا:''مگر جس کو تم چیز، کہتے ہو، کیا وہ کوئی حقیقت رکھتی ہے، اس کا کوئی باطن ہے؟ کیا یہ مایا کا دھوکہ نہیں جو محض ظاہر اور عکس ہو؟ یہ تمہارے پتھر اور پیڑ، یہ کیا سچ مچ ہیں؟''

''مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔'' سدھارتھ نے کہا:''اگر یہ مایا ہیں تو پھر میں بھی مایا ہوں اور یہ بھی میری جیسی فطرت رکھتے ہیں۔یہی تو چیز ہے جو انہیں اتنا پیارا اور محترم بنا دیتی ہے۔اسی وجہ سے تو میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ایک اور نظریہ ہے جس پر بھی تم ہنسو گے۔'' مجھے تو یہ لگتا ہے، گووند، کہ دنیا میں اہم ترین چیز محبت ہے۔بڑے بڑے مفکرین کے لئے ضروری ہوتا ہوگا کہ وہ دنیا کا معائنہ کریں، اس کی تشریح کریں، اس سے نفرت کریں۔مگر میں سمجھتا ہوں کہ اہم چیز ہے دنیا سے محبت کرنا،نفرت نہیں، حقارت نہیں، ہمیں ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرنی، بلکہ یہ کہ ہم اس قابل ہوں کہ دنیا کو، اپنے آپ کو ساری چیزوں کو دیکھیں تو محبت اور احترام اور پسندیدگی کے ساتھ۔''

''میں یہ سب سمجھتا ہوں۔'' گووند نے کہا۔''مگر یہ وہی ہے جسے تتھاگت بدھ نے مایا کہا ہے۔وہ تلقین کرتا تھا فیاضی اور تحمل اور ہمدردی اور صبر کی۔۔۔محبت کی نہیں۔اس نے ہمیں دنیا کی محبت کے بندھن میں بندھن سے منع کیا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' سدھارتھ نے کہا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نور پھیل گیا۔''مجھے معلوم ہے، گووند، اور یہاں آکر ہم معانی کی بھول بھلیوں میں، الفاظ کے تضاد میں پھنس جاتے ہیں، کیونکہ میں اس سے تو انکار نہیں کروں گا کہ محبت کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا وہ گوتم بدھ کی سکھشا کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔اسی لئے تو میں الفاظ پر اتنا شک کرتا ہوں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ یہ تضاد بھی مایا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ گوتم اور میں ہم خیال ہیں۔وہ بھلا کس طرح محبت سے انجان رہ سکتا تھا کہ لوگوں کا سارا دکھاوا اور عارضی حالت جانتا تھا پھر بھی منش جاتی سے اتنا پیار کرتا تھا کہ اپنی ساری عمر اس بات کے لئے وقف کردی کہ لوگوں کو سکھائے، ان کی مدد کرے۔اور اس مہاتما کی طرح میرے چیز الفاظ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے: اس کے کارنامے اور اس کی زندگی میرے لئے اس کے الفاظ، اس کی باتوں سے زیادہ اہم ہیں، اس کے ہاتھ کا اشارہ میرے لئے اس کی رائے سے زیادہ اہم ہے۔اس کے خیالات اور گفتگو سے زیادہ میں اسے اس کی زندگی اور اس کے کام میں بڑا آدمی مانتا ہوں۔''

وہ دونوں بڈھے بہت دیر تک خاموش رہے۔پھر جب گووند چلنے کو تیار ہوا تو بولا:''تمہارا شکریہ سدھارتھ، کہ تم نے اپنے بعض خیالات مجھ پر ظاہر کئے، ان میں بعض انوکھے ہیں۔میں ان کو فوراً تو نہیں سمجھ سکتا۔بہر حال میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں اور تمہارے لئے دعا کرتا ہوں کہ تمہیں سلامتی کے دن ملیں۔''

مگر من ہی من میں وہ سوچ رہا تھا: سدھارتھ بھی عجیب آدمی ہے اور انوکھے خیالات رکھتا ہے۔اس کی باتیں دیوانی لگتی ہیں! اور تتھاگت کے نظریات کتنے الگ ہیں اس سے! وہ بالکل صاف، واضح اور قابل فہم ہیں، ان میں کوئی بات عجیب یا الجھی ہوئی یا مضحکہ خیز نہیں ہے۔مگر سدھارتھ کے ہاتھ پاؤں، اس کی آنکھیں، اس کا ماتھا، اس کا

سانس لینا، اس کی مسکراہٹ، اسکا پرنام کہنے کا ڈھنگ، اس کی چال ڈھال۔ یہ سب اس کے خیالات سے الگ ہو کر مجھے متاثر کرتے ہیں۔ جب سے ہمارے تتھاگت بدھ نروان میں گئے ہیں کسی ایسے آدمی سے نہیں ملا جس سے مل کر مجھے یوں لگا ہو کہ یہ آدمی پوتر ہے، مقدس ہے، سوائے سدھارتھ کے۔ اس کے خیالات چاہے عجیب ہوں اور اس کی باتیں نادانوں کی سی ہوں مگر اس کی نظر اور اس کے ہاتھ، اس کا شریر اور اس کا بال بال، ان سب میں سے ایسی پاکیزگی، شانتی، اطمینان، نرم دلی اور سادھنا پھوٹتی ہے وہ میں نے اپنے تتھاگت گرو کے پری نروان کے بعد کہیں نہیں دیکھی۔''

جب گووند یہ سوچ رہا تھا اور اس کے دل میں کشمکش جاری تھی تو وہ بے حد لگاؤ کے ساتھ سدھارتھ کے سامنے بہت جھک گیا۔

''سدھارتھ'' اس نے کہا، ''ہم اب بڈھے ہو چکے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہم اس جنم میں ایک دوسرے کو پھر نہ دیکھ سکیں۔ مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں دوست کہ تمہیں شانتی مل گئی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ مجھے یہ چیز نہ مل سکی۔ مجھے ایک شبد اور بتا دو، اے میرے بندھو، میرے قابل احترام دوست، مجھے ایسی بات بتاؤ کہ میں جس کا قیاس کر سکوں، جو میں سمجھ سکوں! مجھے ایسی کوئی چیز دو، سدھارتھ، جو راستے میں میری مدد کرے کہ میرا راستہ بہت کٹھن ہے اور اس میں اندھیرا ہے۔''

سدھارتھ خاموش رہا اور چہرے پر ایک مطمئن، شانت مسکراہٹ لئے اسے دیکھتا رہا۔ گووند اس کے چہرے کو پریشانی اور تمنا کے عالم میں دیکھتا رہا۔ اس کی نظروں میں دکھ، ان تھک جستجو اور مستقل ناکامی کی تحریر تھی۔

سدھارتھ نے یہ دیکھا اور مسکرایا۔

''میرے پاس جھک جاؤ۔'' اس نے گووند کے کان میں سرگوشی کی۔ ''آؤ، اور پاس، بہت قریب! مجھے ماتھے پر پیار کرو، گووند۔''

گووند حیران ہوا مگر بے پناہ محبت اور آنے والے لمحے کے کچھ کچھ اندازے نے اسے تعمیل پر مجبور کر دیا کہ وہ ایسا کرے۔ وہ اس کے پاس جھکا اور اپنے ہونٹوں سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ جونہی اس نے ہونٹ رکھے، اس کے ساتھ بہت انوکھی بات ہوئی۔ جب وہ سدھارتھ کی عجیب وغریب باتوں میں گم تھا اور وقت کے تصور کو زائل کرنے کی لاحاصل کوشش کر رہا تھا، نروان اور سنسار کو ایک ہی سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، جب اپنے دوست کے شبدوں کے لئے ایک حقارت اس کے واسطے بے پناہ محبت اور احترام کے جذبات سے ٹکرا رہی تھی تو اس کے ساتھ یہ ہوا۔

اسے اپنے دوست سدھارتھ کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بجائے دوسرے چہرے نظر آ رہے تھے بہت سے چہرے، ایک پورا سلسلہ چہروں کا۔۔۔۔ ہزاروں لاکھوں چہرے جو سب آتے اور غائب ہو جاتے پھر لگتا کہ سب ایک ساتھ وہاں ہیں، ہر لمحہ بدلتے ہیں اور نئے ہو جاتے ہیں، اور جو سب کے سب سدھارتھ تھے۔ اس نے مچھلی کا چہرہ دیکھا، سرمئی مچھلی جو بہت تکلیف سے اپنا منہ کھول رہی تھی، مرتی ہوئی مچھلی جس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ اس نے پیدا ہوئے بچے کا چہرہ دیکھا، لال گلابی اور اس پر بغیبے پڑے ہوئے اور رونے پر تلا ہوا۔ اس نے خونی قاتل کا چہرہ دیکھا جو کسی کے بدن میں چھرا گھونپنے کو تھا، اسی لمحے اس نے دیکھا کہ یہ مجرم ہاتھ پیر سے بندھا نیچے جھک رہا ہے اور جلاد اس کا سر اُڑا رہا ہے۔ اس نے نر اور ناریوں کے ننگے بدن سکرومستی کے عالم میں لپٹے، عاشق کے مرحلے طے کرتے دیکھے۔ اس نے دیکھا کہ لاشیں پڑی ہیں، ساکت، بے جان، ٹھنڈی، کھوکھلی لاشیں۔ اس نے جانوروں کے سر دیکھے۔۔۔۔ سور، مگرمچھ، ہاتھی، بیل، چڑیاں۔ اس نے کرشن کنہیا کو اور اگنی کو دیکھا۔ اس نے یہ روپ اور یہ چہرے ایک دوسرے سے ہزار رشتوں میں جڑے ہوئے دیکھے، سب ایک دوسرے کی مدد کرتے ہوئے، ایک دوسرے سے محبت اور نفرت کرتے ہوئے، ایک دوسرے کو تباہ و غارت کرتے ہوئے اور از سر نو پیدا ہوتے ہوئے دیکھے۔ ان میں سے ہر ایک فانی تھا، ہر اس چیز کا دکھتا اور من بھاتا نمونہ جو عارضی ہے۔ پھر بھی ان میں سے کوئی نہ مرتا، وہ بس بدل جاتے، از سر نو پیدا ہوتے رہتے، نئے جنم لیتے رہتے، اور مستقلاً نیا چہرہ لئے ہوتے۔ ایک چہرے اور دوسرے چہرے کے درمیان بس وقت تھا۔ یہ سارے چہرے اور شکلیں ٹھہرتے، بہتے۔ ان کا ملاپ ہوتا، ان سے دو بن جاتے، دور نکل جاتے اور ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے، اور ان سب کے اوپر سارے وقت کوئی پتلی سی چیز تھی، غیر حقیقی پھر بھی موجود، باریک شیشے یا برف کی طرح تنی ہوئی، شفاف جلد جیسی، سیپ کی طرح، پانی کے نقاب کی طرح۔۔۔۔ اور یہ نقاب سدھارتھ کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا جس پر گووند ہونٹ ثبت کر رہا تھا۔ اور گووند نے یہ نقابوں جیسی مسکراہٹ دیکھی، بہتی شکلوں کی یکتائی کی مسکراہٹ، یہ مسکراہٹ جو تمام اموات اور پیدائشوں کی ہم وقتی کی مسکراہٹ تھی۔ سدھارتھ کی یہ مسکراہٹ۔۔۔۔ یہ تو بالکل وہی مطمئن، کومل، اتھاہ مسکراہٹ، شاید مہربان، شاید مذاق اڑاتی ہوئی، ہزار روپ والی مسکراہٹ جو گووند نے بہت دفعہ رعب کے عالم میں گوتم بدھ کے چہرے پر دیکھی تھی۔ گووند جانتا تھا کہ تتھاگت اس سجاؤ سے مسکراتا ہے۔

اب اسے نہ یہ معلوم تھا کہ وقت موجود بھی ہے یا نہیں، اور یہ مظاہرہ ایک لمحے کے لئے ہوا یا سو برس کے لئے، یہ کوئی سدھارتھ تھا بھی، اور گوتم، اور ایک ذات اور دوسری بہت سی، جنہیں الوہی تیر سے ایسا کاری زخم لگا تھا جس سے بہت لطف آتا تھا۔ عالم وجد میں اور کیفیت انبساط میں گووند کھڑا رہا اور سدھارتھ کے شانت چہرے پر جھکا رہا جس پر اس نے ابھی بوسہ دیا تھا، جو ابھی ان تمام موجودہ اور آئندہ شکلوں کا رنگ منچ تھا۔ ہزار رنگ روپ والے آئینے کے غائب ہو جانے پر بھی اس کا ناک نقشہ نہ بدلا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے مسکرایا، شاید بہت مہربانی کے ساتھ، شاید بہت مذاق اڑاتے ہوئے، جیسے تتھاگت مسکرایا تھا۔

گووند جھک گیا۔ آنسو جو رک نہ سکے اس کے بوڑھے چہرے پر ٹپکنے لگے۔ بے پناہ محبت اور بے حد عاجزانہ تعظیم کے جذبات اس پر چھا گئے۔ وہ نیچے جھکا، بالکل زمین کو چھو گیا، اس شخص کے سامنے جو وہاں ساکت بیٹھا تھا اور جس کی مسکراہٹ اسے ہر اس چیز کی یاد دلاتی تھی جس سے اس نے اپنی زندگی میں محبت کی تھی، ہر وہ چیز جسے اس نے مقدس سمجھا تھا اور جو اس کی زندگی میں قدر و قیمت رکھتی تھی۔

©۔ جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

قسط نمبر18

مکالمہ ، سدھارتھ اور آگہی

سلیم احمد ....آصف فرخی

آصف فرخی:ہرمن ہیسے کا ''سدھارتھ'' فلسفیانہ ناول ہے۔ان معنوں میں نہیں کہ اس میں کسی نظریے کا پرچار کیا گیا ہے یا تبلیغ ہے، بلکہ ان معنوں میں کہ اس کی کہانی خیال کو آگے بڑھاتی ہے،اس میں ایسی تمثیل ہے جو فکر کے تابع ہے۔اور اس کا جو فکری مرکز مجھے محسوس ہوا ہے جس کی وجہ سے میں اس کے ترجمے کی طرف مائل ہوا وہ یہ امر ہے کہ ''سدھارتھ'' ایک نوجوان کی خود آگہی کی کہانی ہے سدھارتھ کس طرح یہ آگہی حاصل کرتا ہے اور اس آگہی کے بعد وہ کس طرح دکھ اٹھاتا ہے اور پھر اپنی اس آگہی کو اپنی زندگی میں کس طرح بروئے کار لاتا ہے۔۔۔۔میرا خیال ہے کہ اس کتاب پر اس زاویے سے گفتگو کی جائے۔

سلیم احمد: یہ تم نے ،آصف فرخی، بات بالکل صحیح کی ہے اس کا جو موضوع ہے وہ خود آگہی ہے، خود آگہی اور حقیقت آگہی۔یعنی اس کی دو جہات ہیں۔ایک تو یہ کہ اپنے نفس کو جانے ،اپنے آپ کو جانے اور دوسرے حقیقت کو جانے۔اس بات کی اور اس موضوع کی اہمیت میرے نزدیک یہ ہے کہ ٹامس مان نے کہا تھا کہ بیسویں صدی میں انسانی تقدیر سیاسی اصطلاحوں میں لکھی جا رہی ہے تو یہ زمانہ ایسا ہے اور غالب رجحان یہ ہے کہ ہم سیاسی اور معاشی مسائل میں الجھے ہوئے ہیں اور ہمارا سارا ادب کسی نہ کسی طرح اس قسم کے مسائل اور انہی باتوں سے متاثر ہوا ہے۔یہاں تک کہ نہ صرف ادب بلکہ آپ یہ دیکھئے کہ مذہبی تعلیم بھی، جو خود آگہی کا اور خدا آگہی کا اور حقیقت آگہی کا اور عرفان حقیقت کا سب سے بڑا ذریعہ تھا،اس میں بھی سیاسی و معاشی تعبیریں ملتی ہیں اور یہ غلبہ پا گئی ہیں، تو آپ یہ دیکھئے کہ جتنے ناول لکھے گئے ہیں انکے موضوعات آپ کو معاشرتی ملیں گے، سیاسی ملیں گے، معاشی ملیں گے لیکن ان میں یہ مسئلہ، جو ہرمن ہیسے نے ''سدھارتھ'' میں اٹھایا ہے۔یہ آپ کو نہیں ملے گا۔ان معنوں میں یہ ایک منفرد ناول ہے کہ یہ اس مسئلے کے مختلف جہات کو بیان کرتا ہے۔

آصف فرخی: سلیم صاحب، گفتگو یہ ہونی چاہیے کہ سدھارتھ کا کردار اس آگہی کو حاصل کرنے کے لئے کن منازل اور کن مقامات سے گزرتا ہے اور ایک باشعور قاری کا ان باتوں کے بارے میں کیا ردعمل ہوتا ہے۔تھوڑی دیر کے لئے ہم ناول کی تنقید کے روایتی لوازمات کو پس پشت ڈال دیں اور اس کے کردار، واقعات، بیانیہ، پلاٹ، عمل وغیرہ کو الگ الگ عناصر کی حیثیت سے نہ دیکھیں بلکہ اس ناول کا ایک فکری اور جذباتی وحدت کے طور پر مطالعہ کریں کہ یہ ناول ہم سے کیا کہتا ہے، ہمارے روحانی مطالبات کو کس طرح مطمئن کرتا ہے۔یعنی میں زندگی کے ان تجربات کو جانچنا چاہتا ہوں جو اس ناول میں پیش کئے گئے ہیں۔

سلیم احمد: یہ ٹھیک ہے۔میں نے ''سدھارتھ'' کی اہمیت کو دو طرح محسوس کیا۔ایک تو جو بات ابھی میں نے کہی کہ ہمارے ناولوں کے موضوع جو رہے ہیں تو ان میں سماجی حقیقت نگاری ہے ایک قسم کی، کچھ نفسیاتی ڈائی مینشن دکھا دیئے، سیاسی، سماجی، معاشی موضوع وغیرہ، لیکن یہ جو پہلو ہے جس کا میں نے ذکر کیا وہ مجھے ''سدھارتھ'' کے علاوہ کہیں اور نہیں ملا۔اسی چیز کی اہمیت یہ تھی جو اس ناول میں فارمولیٹ ہوگئی کہ ایک عرفان نفس اور عرفان حقیقت کا طریقہ مشرقی ہے، اس کی بھی میں تفصیل بیان کروں گا۔اس کے مقابل سدھارتھ میں وہ طریقہ رکھ دیا گیا جس کو میں مغربی طریقہ کہوں گا۔اور ان دونوں کا تقابل کرنے کی کوشش۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہرمن ہیسے نے جو روایتی عرفان نفس اور عرفان حقیقت کا طریقہ تھا، جس کو میں مشرقی کہہ رہا ہوں، اس کے مقابلے پر مغربی یا جدید طریقوں کو سامنے رکھ دیا ہے۔اس کو آپ اس طرح سمجھئے کہ مشرق کا طریقہ یہ ہے کہ ہم پیغمبروں کو مانتے ہیں، صوفیائے کرام کو مانتے ہیں، ہمارے یہاں تصوف کے سلسلے ہیں، مذاہب کے سلسلے ہیں تو اس میں یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی جو پیغمبر ہوتا ہے اس کو حقیقت کا تجربہ ہوتا ہے یا اس سے حقیقت براہ راست مخاطب ہوتی ہے، پھر اس کے بعد اسے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اسے لے کر وہ لوگوں تک جاتا ہے، ایک خبر کی صورت کہ میرے ساتھ یہ ہوا اور لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں یا تسلیم نہیں کرتے۔اور اس اعتبار سے ان کے مقامات طے ہوتے ہیں۔اور تصوف کے سلسلوں میں یہ ہے کہ غوث یا قطب یا اس عہد کا بڑا صوفی اپنے مرید بناتا ہے اور مرید اس کے دیئے ہوئے ضابطوں کے مطابق اور اس کی دی ہوئی مشقوں اور ریاضتوں کے مطابق وہ منازل طے کرتے ہیں اس کی نگرانی میں۔آصف فرخی: اور اس طرح اس حقیقت کو حاصل کرتے ہیں جو اس پر منکشف ہوئی ہے۔

سلیم احمد: مہاتما بدھ کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ بدھ نے تجربات حاصل کئے اور تجربات کے بعد عرفان حقیقت ان کو ہوگیا جسے وہ لوگوں کے سامنے لے کر آئے اور ان کے ماننے والوں کا سلسلہ پیدا ہوگیا۔ہرمن ہیسے صاحب کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔کسی ایک آدمی کا عرفان حاصل کرنا اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کا اس کی اقتداء کرنا ان کو ماننا صحیح نہیں ہے۔صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے تجربے سے حقیقت کو تلاش کریں۔یہ جو بات کہی گئی ہے اس ناول

میں یہ میرے خیال میں اس ناول کا اہم ترین پہلو ہے اور اسی پر مجھے سب سے زیادہ اعتراض ہے اور اس کو سامنے رکھ کر میں دیکھتا ہوں کہ اس میں کیا نا کامیاں اس کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں ۔اس ناول نے جس طرح یہ مسئلہ پیش کردیا ہے اور جس طرح کھل کر سامنے آ گیا وہ اور کہیں نہیں ہوا ۔اب اس کے مدراج تم کہو تو میں بیان کردوں ۔تین چیزیں انہوں نے بیان کی ہیں ۔اس سے پہلی بات ان کے نزدیک یہ ہے کہ جو آدمی راہ سلوک میں اور عرفان نفس میں داخل ہونا چاہتا ہے اور اس میں قوت فیصلہ ہونی چاہیے قوت فیصلہ کہ وہ فیصلہ کر لے اور پھر اس پر قائم رہے یہی بات سدھارتھ میں ہے کہ وہ ایک بار فیصلہ کر لیتا ہے حالانکہ اس کہ بڑا سا گھر سے جہاں وہ رہتا ہے ۔مادیت میں اور اپنے باپ کے سلسلے میں تو وہ بڑی عزت بڑا مقام حاصل کرتا ۔صحیح بات یہ کہ وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ میں یہاں نہیں رہوں گا اور پھر وہ اس فیصلے پر عمل کرتا ہے ۔

آصف فرخی :اسی فیصلے سے اس میں اتنی استقامت ،اتنی قوت آ جاتی ہے کہ وہ اپنی بات اپنے باپ سے منوالیتا ہے اور جب تک اس کا باپ اس کی بات مان نہیں لیتا وہ ڈٹا رہتا ہے ۔

سلیم احمد: یہیں سے ناول شروع ہوتا ہے ۔پہلی بات ہوگئی فیصلہ اور یہ عزم کہ انسان جو کچھ ہو اس پر قائم رہے ۔اس کے بعد وہ مختلف لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں ،سادھوؤں کے ساتھ جاتے ہیں ۔اور تین باتیں انہوں نے سیکھی ہیں کہ صاحب میں سوچ سکتا ہوں ، میں انتظار کر سکتا ہوں ، فاقہ کر سکتا ہوں ،یعنی بھوکا رہ سکتا ہوں ۔تو ان چیزوں میں بڑی فلسفیانہ گہرائی ہے اور ان کے ذریعے وہ زندگی کا سفر طے کرتا ہے ۔ایک چیز جو پیدا ہو جاتی ہے اور بہت باریک اور گہری چیز ہے ، وہ چیز ہے جس کو میں کہتا ہوں کہ جب انسان کسی راہ پر چلتا ہے تو اس کے اندر ایک مرکز کہیں پیدا ہو جاتا ہے ،اس کے اندر قائم ہو جاتا ہے ،اور اس مرکز کی پکار پر لبیک کہنا سب سے پہلا مرحلہ ہے ۔اس وقت تک سالک کو اپنی ریاضتیں جاری رکھنی چاہئیں جس وقت تک یہ مرکز نہ پیدا ہو جائے اور جب یہ پیدا ہو جائے تو پھر اس کی پیروی کرے ۔تو اس کو میں اپنی پرانی کہانیوں کے پس منظر میں رکھ کر دیکھتا ہوں کہ آپ کو معلوم ہے خوزستان کے شہزادے کسی مہم پر نکلے ،ایک باغ میں جا پہنچے اور باغ اجاڑ تھا ،اور وہاں پانی نہیں تھا اور گھاس سوکھ گئی تھی اور پودے خشک ہو گئے تھے اور انہوں نے وہ صاف کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ایک بابا وہاں رہتے تھے ، چھ مہینے جاگتے تھے چھ مہینے سوتے تھے ،تو انہوں نے ان کی پلکیں کتریں ،بال ترشوائے اور کپڑے بدلوائے ، سوتے میں ،اور وہ اٹھے تو انہوں نے دیکھا کہ باغ سرسبز ہو گیا ہے اور ان کی حالت بھی بدل گئی ہے تو انہوں نے پوچھا کہ بیٹے کہاں جا رہے ہو ،تو انہوں نے ایک گیند دے دی کہ بیٹا جدھر یہ گیند چلی جائے تو بھی ادھر چلے جانا ۔یہ گیند کیا ہے ، یہ اندرونی مرکز ہے انسان کا جو وہ کہتا ہے جائے اس کو مانتے جایئے اور کوئی خارجی احکام یا ہدایت نامہ آپ کے لئے نہیں ہے ۔تو سدھارتھ یہ چیز اپنے اندر حاصل کر لیتا ہے ۔

آصف فرخی :اور وہ اہمیت بھیا سی چیز کے حصول کو دیتا ہے ۔وہ کہتا ہے کہ انسان کا پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو جانے ۔یعنی اپنی دریافت کرے ،اپنی ذات اور اس کے تقاضوں اور اس کے امکانات کو سمجھے ۔

سلیم احمد: اب یہ دیکھئے کہ ''اپنی ذات کو سمجھنے'' کا مطلب یہ کہ اپنی اندرونی آواز کو پالے ۔اور جب اس کو پا جائے تو اسی کی پیروی کرے ، حالات کتنے ہی مخالف ہوں اور کچھ ہوں یا دباؤ ہو ۔یہ اتنی باریک اور گہری بات کہی ہے ہر من ہیسے نے کہ میں سمجھتا ہوں اس کو بہت اہمیت ملنی چاہیے ۔اب تم یہ دیکھو کہ اس کی مثال اس نے یہ دی کہ وہ آ رہا ہے اور ایک عورت اسے نظر آتی ہے اور اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے ۔یہ کملا کے ملنے سے پہلے کی بات ہے ۔عورت بھی آمادہ ہے اور یہ اس کو بوسہ دیتا ہے کہ اس کے دل سے آواز آتی ہے ''نہیں'' تو یہ اس کو چھوڑ دیتا ہے ۔یہ جو انکار کرنے کی صلاحیت ہے ، یہی اصل مسئلہ ہے اور اسی کے سہارے وہ آگے چلتا ہے ۔اور پوری زندگی یہ جو اندر کی آواز ہے اس پر عمل کرتا ہے ۔

آصف فرخی :اسی طرح آسودگی کی زندگی کا عادی ہو جانے کے بعد بھی جب یہ آواز اس کو انکار پر اکساتی ہے تو وہ کملا کو بھی چھوڑ دیتا ہے اور اس آواز کی تعمیل میں اور اس کے اعتماد میں پھر جیون یاترا پر نکل کھڑا ہوتا ہے ۔

سلیم احمد :اب اس کی جو منزلیں ہیں ان کو آپ دیکھئے ۔پہلے باپ کے گھر سے نکلنا ، پھر یوگیوں ،سنیاسیوں کے ساتھ رہنا ،ان سے سیکھنا ، پھر وہاں سے بھی نکلنا ،شہر آنا ،کملا سے ملنا ،بیوپاری بن جانا .....

آصف فرخی :اس سے پہلے وہ مہاتما بدھ سے ملتا ہے اور وہاں وہ صورت حال پیش آتی ہے جس کو آپ نے مشرقی طریقے سے تضاد کہا ہے کہ سدھارتھ تتھاگت کا چیلا بن جانے کے بجائے اپنی جستجو اور تشکیک کو ترجیح دیتا ہے ۔اس واضح فرق کو سدھارتھ اور گووند کے طرز عمل سے ابھارا گیا ہے یعنی مہاتما بدھ کے سلسلے میں دونوں کے رویے میں جو فرق ہے ۔گووند نے تسلیم کی خو اختیار کر لی ہے جب کہ سدھارتھ غالب کی زبان میں کہتا ہے

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ بھی ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

سلیم احمد: اور آگے چلیں تو وہ تاجر بن جاتا ہے۔تاجر بننے کی دو منزلیں ہیں۔ایک منزل تو وہ ہے جہاں سدھارتھ تاجر ہونے کی ایکٹنگ کر رہا ہے۔راج یوگ جو تاجروں، حکمرانوں اور سیاست دانوں کے لئے یوگ کا ایک طریقہ ہے، اس میں اس ایکٹنگ کرنے کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے۔اور وہ جو کہتے ہیں نا کہ باز دامن ترمکن ہوشیار باش۔یعنی انسان اپنا پورا رول ادا کر رہا ہو مگر اس کا ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ اور بلند ہو، جیسے کنول کے پھول اور جھیل کا رشتہ ہوتا ہے۔اس کا باطن اس میں ملوث نہ ہو۔مگر اس کے بعد ایک منزل ایسی آجاتی ہے کہ وہ اپنے پچھلے تجربات کو بالکل بھول جاتا ہے اور اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔گویا دنیا اس پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے اور اس کے اندر کا سالک کچھ عرصے کے لئے سو جاتا ہے۔مایا میں پھنسنے کا یہ تجربہ بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے بہت اہم ہے کیونکہ ساری ریاضت کا مقصد تو اسی مایا جال سے نکلنا تھا، یہ ساری مشقت اور عرفان نفس اسی سے نکلنے کے لئے تو ہے۔تو اس وقت تک وہ مایا میں ملوث نہیں ہوا تھا۔میں یہ سوال اٹھاتا ہوں کہ اگر ہرمن ہیسے اس ناول کو وہاں سے شروع کرتا جہاں سدھارتھ ایک تاجر ہے اور مایا جال میں پھنسا ہوا تھا تو اس سفر کی نوعیت کیا ہوتی؟ کیا وہ ان منزلوں تک پہنچتا؟

©۔جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com

آخری قسط

آصف فرخی: جی ہاں، دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ ہرمن ہیسے نے مایا جال کو سدھارتھ کی زندگی کے وسط میں رکھا ہے، یعنی یہ واقعات کا کلائمکس ہے۔ گویا دنیا انسان کے لئے سب سے بڑی ترغیب ہے۔ سدھارتھ بھی ہیسے کا کردار ہونے کی وجہ سے اپنے اندر مصنف کا یہ لاشعوری نقطۂ نظر رکھتا ہے کہ یہ جو عیسوی عقیدہ ہے دنیا کے بارے میں اور مصنف کے ذریعے سے یہ کردار میں منعکس ہو جاتا ہے۔ سدھارتھ معصوم ہے اور دنیا کے جال میں پھنس جاتا ہے۔

سلیم احمد: نہیں، میرا سوال یہ ہے، آصف فرخی، کہ مایا جال میں وہ اگر پھنسا تھا تو آپ نے تو اس کو برہمن سے اٹھایا تھا، Initiating طبقے سے اٹھایا تھا تو وہ پہلے جو عرفان نفس کی ریاضت کرتا ہے اس کے طریقے روایتی ہوتے ہیں۔ اگر مصنف نے اس کو دنیا سے اٹھایا ہوتا تو وہ کیا ان منازل پر بغیر بدھ کی مدد کے جا سکتا تھا؟ قصہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک حقیقت یہ ہے کہ انسان دو چیزوں سے زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک تو وہ اثرات جو اس کو زندہ رکھتے ہیں حیاتیاتی سطح پر، اس کے معاشی، نفسیاتی، سماجی، جبلی احوال و مسائل، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا یہ سب۔ اور انسان کی زندگی اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اسے وہ چیز نہ ملے جسے کلام خداوندی کہتے ہیں۔ اس کی صورتیں یہ ہیں کہ وہ نبوت اور الہام کے وسیلے سے منکشف ہوا ہو یا تصوف کی روایت کے ذریعے سے پہنچا ہو۔ لیکن اس کلام خداوندی کے بغیر کوئی روحانی سفر ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ تو اسی چیز کو ہرمن ہیسے نے بدلنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی خود اپنے تجربے سے، بغیر کلام خداوندی کے پہنچ جائے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ اگر اس ناول کو، یعنی سدھارتھ کے کردار کو تاجر سے اٹھاتے تو کبھی دریا کنارے انہیں ''اوم'' کا جو تجربہ ہوا ہے وہ نہ ہوا ہوتا۔ وہ تجربہ سدھارتھ کو اس لئے ہوا ہے کہ یہ چیز پہلے سے اس کے اندر Conditioned تھی۔

آصف فرخی: گویا اپنے برہمن اساتذہ سے اس نے جو کچھ حاصل کیا تھا.....

سلیم احمد: وہ تعلیمات اس کے اندر موجود تھیں، ان کا Realization ہو گیا۔ یہ ساری باتیں اس کے باطن میں موجود تھیں اور اب پایہ تکمیل کو پہنچ گئیں۔ اور ہوتا یہی ہے، عرفان نفس کے اور عرفان حقیقت کے معنی یہ ہیں کہ تیرے نفس پر منکشف ہو جائے، جو چیز تیرے اندر موجود ہے وہ کھل جائے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کی ابتداء وہی ہے جو اس کی انتہا ہے۔ ابتداء ہی اس کی انتہا ہے۔ یعنی سالک وہیں پہنچتا ہے جہاں سے وہ شروع کرتا ہے۔ تو اگر سدھارتھ کے شروع میں یہ موجود نہ ہوتا تو اس کا انجام یہ نہ ہوتا۔

آصف فرخی: اسی بات کو زین بدھ مت کے عقیدے میں یوں کہا گیا ہے کہ جب زین کی راہ پر چلنے والا یا چیلا شروع کرتا ہے تو اسکے لئے پہاڑ پہاڑ ہوتے ہیں اور دریا دریا۔ جب وہ اس راہ پر چل پڑتا ہے تو اس کے لئے دریا دریا نہیں رہتے اور پہاڑ پہاڑ نہیں ہوتے۔ پھر جب وہ اپنے سفر کی منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے لئے پہاڑ پھر سے پہاڑ ہو جاتے ہیں اور دریا دوبارہ دریا ہو جاتے ہیں۔ سدھارتھ کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ اپنے سفر کے انجام میں وہ اشیاء کی حقیقت اور مظاہر فطرت کی معصومیت تک واپس پہنچ جاتا ہے۔ وہ دنیا سے منہ موڑنے کے بعد واپس دنیا کی طرف لوٹ آتا ہے مگر دنیائے فطرت کی طرف آتا ہے۔

سلیم احمد: اسی چیز کو اسلامی تصوف میں مقام جمع الجمع اور مقام فرق کہتے ہیں۔ اچھا، مقام فرق آخر میں آیا، مقام فرق اولاً تو کفر کی منزل ہے۔ جب فرق ہوتا ہے عام حالت میں تو ہمارے لئے پیالی پیالی ہے اور کرسی کرسی ہے۔ جب مقام جمع میں پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں ہر چیز خدا ہے۔ جب جمع سے فرق میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نہیں یہ تو پیالی ہے۔ اسی سے وحدت الشہود کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ ہرمن ہیسے نے اس چیز پر غور نہیں کیا کہ کیا صرف خالص تجربے سے Empirical بنیاد پر اور کلام خداوندی کے بغیر، esoteric حلقے کے بغیر کوئی انسان عرفان نفس تک پہنچ سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک تو ممکن نہیں۔ اس لئے مغرب کا جو طریقہ ہے، جس کی پیشکش ہرمن ہیسے نے کی ہے، وہ دراصل غیر روایتی بلکہ روایت دشمن طریقہ ہے اور اس میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ خود ہرمن ہیسے کی سوانح دیکھئے تو کیا اس نے اس روایت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی؟

آصف فرخی: ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ سدھارتھ برہمن زادہ ہے اور روایتی علوم سے واقفیت رکھتا ہے اور پھر بھی دنیا کے جال میں پھنس گیا۔ سدھارتھ پر آپ کو یہ اعتراض ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ سدھارتھ آج کا نوجوان ہے، ہمارے معاشرے میں زندہ رہتا ہے۔ جہاں ہمارے نوجوان نے اپنے گھر میں وہ روایتی علوم اور وہ قدیم فلسفہ و دانش کی باتیں دیکھی اور سنی ہیں مگر اس کے نزدیک یہ بے معنی ہو چکی ہیں، ان کی کوئی Relevance نہیں ہے کیوں کہ وہ جس طرح کی زندگی گزارتا ہے، وہ جو کچھ سوچتا ہے، جن مسائل اور تجربات سے گزرتا ہے، اس کی جو روحانی کشمکش ہے تو وہاں باپ دادا کے روایتی علوم اس کے کام نہیں آتے۔ وہ ان سے کٹ کر ان کے لئے Alien بن چکا ہے، اور دنیا کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ اس جال سے نکلے تو وہ عرفان حقیقت حاصل کرے۔

سلیم احمد: وہ عرفان حقیقت حاصل کرے گا اسی روایت کے ذریعے سے۔۔۔۔روایت کی بازیافت کے ذریعے۔ اس بازیافت کے لئے اس کا مایا جال میں پھنسنا ضروری نہیں ہے۔ یہی تو میں نے کہا کہ اگر ناول کا آغاز وہ نوجوان ہوتا جو آپ کو بعد میں ملتا ہے۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ کردار کا پس منظر کیا ہے اور اس کردار کو کہاں سے اٹھایا گیا ہے۔ اگر وہ شروع ہی سے مایا جال میں پھنسا ہوا ہوتا تو ناول کی صورت مختلف ہوتی۔ اب فریض کیجئے کہ سدھارتھ ایک تاجر ہے، اسکا باپ ایک تاجر ہوتا اور بیٹا باپ کے ساتھ تجارت سیکھتا تو یہ ناول کیسا ہوتا ؟ تب کہیں اس میں وہ Alienation پیدا ہوتے ہوئے دکھایا جاتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔

آصف فرخی: ہرمن ہیسے نے یہ دکھایا ہے کہ سدھارتھ جب اپنے باپ کے گھر میں رہ رہا ہے تو وہ ان تمام چیزوں کو، اشنان اور چڑھاوے چڑھانے کو، نمائش سمجھتا ہے، ہیسے نے یہ نہیں دکھایا کہ وہ وہاں کیا بے چینی محسوس کر رہا ہے، وہاں خوش کیوں نہیں ہے، ہیسے نے صرف یہ بیان کر دیا کہ سدھارتھ وہاں مطمئن نہیں تھا۔

سلیم فرخی: ہرمن ہیسے نے یہ جو برہمنیت تھی اس کے ظاہر کو دیکھا ہے یعنی اس کا جو دنیاوی پہلو ہے، ان تعلیمات کے اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ جو تعلیمات اس کے لئے اوم سے واقف ہونے کا سبب بنیں ان کو اس نے اہمیت نہیں دی۔

آصف فرخی: ٹھیک ہے، سدھارتھ کی اگلی منزل یہ ہے کہ وہ مہاتما بدھ سے ملتا ہے اور وہاں سے بھی نا آسودہ پلٹتا ہے۔ گرو سے دور چلے جانے کے بعد اس کی زندگی میں ناری آتی ہے، وہ کملا سے ملتا ہے، عورت اس کے لئے تجربہ بنتی ہے۔

سلیم احمد: ایک بات میں عرض کروں۔ کملا والے قصے میں مجھے کوئی روحانی جہت نہیں ملتی۔ وہ محبت کا کھیل سیکھنا چاہتا ہے اس لئے ایک نرتکی سے ملتا ہے جو محبت کے بھید، جسم کے اسرار جانتی ہے جس طرح بانسری بجانے والا بانسری کو جانتا ہے۔ وہ اس سے محبت کرنا سیکھتا ہے۔ یہاں کوئی روحانی پہلو نہیں ہے، وہ بس اس کے جسم سے آسودہ ہوتا ہے۔ بلکہ اس عورت میں یہاں زیادہ گہرائی نظر آتی ہے۔ اس عورت میں دوسرے شخص سے لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔

آصف فرخی: وہ سدھارتھ کی نفسیات کو سمجھتی ہے کیونکہ وہ اس سے کہتی ہے کہ تم کسی سے بھی محبت نہیں کر سکتے کیونکہ تم اپنے آپ سے محبت کرتے ہو۔ کملا سدھارتھ کا دل جیت لیتی ہے اور پھر اسے کھو دیتی ہے، مگر اس کے کردار میں کہیں کہیں تو سدھارتھ سے زیادہ دل کشی اور انسانی گہرائی ملتی ہے۔

سلیم احمد: اس میں ایک بڑا نازک پہلو ہے۔ جہاں کملا کہتی ہے کہ مجھ سے پیار کرنا چاہتے ہو تو دولت حاصل کرو۔ وہ پوچھتی ہے تمہارے پاس ہے کیا، اور جب سدھارتھ وہ تین چیزیں گنواتا ہے تو کہتی ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ پھر سدھارتھ کہتا ہے کہ اسی سے مجھے یہ قوت حاصل ہوئی ہے کہ میں جو چاہتا ہوں حاصل کر لیتا ہوں۔ میں کسی چیز کے بارے میں سوچتا ہوں اور اس مقصود کے سوا میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں ہوتا، باقی سارے خیالات کو میں روک دیتا ہوں۔ اور انتظار کے یہ معنی ہیں کہ میں اس کو duetime دوں اس کی تکمیل کے لئے، اور فاقہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ میں اتنی دیر تکلیف اور مصیبت برداشت کر سکوں۔ اس طرح کچھ کئے بغیر میں اپنے مقصد کو حاصل کر لیتا ہوں۔ یہ بہت اہم بات ہے۔

آصف فرخی: یہاں پر ایک اور مسئلہ پیدا ہوتا ہے، اور اس وجہ سے بھی سدھارتھ کی کہانی ہمارے معاشرے کے لئے اہم نظر آتی ہے۔ کملا کے نزدیک ان تینوں باتوں کی، یعنی سوچنا، انتظار کرنا اور فاقہ کرنا، ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے تو ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کا بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا ہو، جس کے کپڑے اور جوتے عمدہ ہوں۔ اس طرح وہ سدھارتھ، جو راہ حقیقت کو جویا اور سالک ہے، مایا جال کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ یہاں پر وہ جدید معاشرے کی عورت معلوم ہوتی ہے جس کے نزدیک ذہنی عمل اور عالمانہ طرز زندگی کے بجائے مادی آسائشوں کا حصول زیادہ اہم ہے۔

سلیم احمد: بالکل، بالکل۔ اور مایا تو وہ خود ہے۔ ہندو روایات کی رو سے عورت تو خود مایا کا ایک حصہ ہے۔ بلکہ مایا کو جنم دینے والی، ایک اور چیز جو بہت اہمیت کی حامل ہے، اور وہ ہے سدھارتھ کا بیٹا۔ جس طرح سدھارتھ نے اپنے باپ سے اور باپ کی روایت سے بغاوت کی تھی اور اپنے باپ کی تمام خواہشات کے باوجود آزاد ہو گیا تھا، وہی تجربہ سدھارتھ کو اپنے بیٹے کے ساتھ ہوا۔ سدھارتھ کو اپنے باپ کا تجربہ ہوتا ہے اور اسکا بیٹا اس کی زندگی سے منہ موڑ کر واپس شہر چلا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئندہ نسل بالکل آزاد ہوتی ہے، وہ مستقبل میں پھینکے ہوئے تیر کی طرح ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔

آصف فرخی: یہ نسلی تفاوت والی بات ہے کہ بیٹوں کی نسل باپ کی نسل کے تجربوں کو مسترد کرتی ہے اور خود ہر چیز کا تجربہ براہ راست کر کے دیکھنا چاہتی ہے۔ دونوں کے رویے میں جو فرق ہے اس کو ہیسے نے کس عمدگی سے پیش کیا

ہے۔ مجھے تو ہیسے کا کمال فن یہی نظر آتا ہے کہ وہ کسی بھی خیال یا تصور کو جاگتے
کرداروں اور واقعات کے ذریعے پیش کر کے زندہ کر دیتا ہے، ہمارے تجربے کا ایک حصہ بنا دیتا ہے۔ اچھا، اب آگے بڑھیں۔ اب بات یہاں تک پہنچی کہ سدھارتھ دریا کنارے واسو دیو سے ملتا ہے اور اس کے وسیلے سے اطمینان، سکون یا شانتی، جو کچھ بھی کہیں، حاصل کر لیتا ہے۔ وہاں پر....

سلیم احمد: واسو دیو اس کو یہ سکھاتا ہے کہ ایک چیز جو تم کو حقیقت تک پہنچا سکتی ہے وہ ہے کامل توجہ۔ چیزوں کو دیکھنا، سننا، محسوس کرنا، ان کی واقفیت حاصل کرنا۔ دریا سے باتیں کرنے کا مطلب ہے دریا پر توجہ دینا، محسوس کرنا، اسے اہمیت دینا، اس کے اتار چڑھاؤ، مدوجزر کا مطالعہ کرنا۔ واسو دیو اس کو یہ سمجھاتا ہے کہ اگر تو نے یہ مکمل توجہ حاصل کر لی تو پھر تو حقیقت تک پہنچ گیا۔ اور یہ چیز سدھارتھ حاصل کر لیتا ہے، پھر دریا اس سے باتیں کرتا ہے۔

آصف فرخی: سدھارتھ دریا کنارے جو زندگی گزارتا ہے وہ مجھے مسئلے کا بہت سادہ حل معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ دنیا تیاگ دیتا ہے۔ دریا زندگی کی علامت ہو سکتا ہے کہ سدھارتھ اس کے کنارے جھونپڑی ڈالے بیٹھا ہے، بازار سے گزر تو رہا ہے مگر خریدار نہیں ہے۔

سلیم احمد: نہیں، وہ دریا وقت ہے۔ دریا زندگی اور موت کے درمیان حد فاصل ہے لوگ جس میں ادھر سے ادھر آ جا رہے ہیں، یہ وقت کی جوئے رواں ہے۔ اس طرح ناول میں شعور زماں کی جہت بھی موجود ہے۔ یہ شعور روحانی آدمی کے لئے بے حد اہم ہے، بلکہ گورجیف نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ انسان صرف وقت کا شعور حاصل کر لے، وقت کا احساس کر لے، evertime کا رہے تو ساری روحانی ترقی ممکن ہے۔

آصف فرخی: دریا کی معنویت یہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں پر مجھے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی وہ لائنیں یاد آ رہی ہیں جو قرۃ العین حیدر نے ''آگ کے دریا'' کی ابتداء میں درج کی ہیں:

میں دیوتاؤں کے متعلق زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دریا
ایک طاقتور مٹیالا دیوتا ہے۔ تند مزاج، غصیلا
اپنے موسموں اور اپنے غیظ و غضب کا مالک، تباہ کن
وہ ان چیزوں کی یاد دلاتا رہتا ہے جنہیں انسان بھول جانا چاہتے ہیں
وہ منتظر ہے اور دیکھتا ہے اور منتظر ہے
دریا ہمارے اندر ہے۔ سمندر نے ہمیں گھیر رکھا ہے.....

ایلیٹ کی یہ سطور سدھرتھ کے دریا کی یاد دلاتی ہیں۔ خود ایلیٹ نے بھی ہیسے کا ایک مضمون ''دی ویسٹ لینڈ'' کے حوالوں میں شامل کیا ہوا ہے۔

سلیم احمد: اس دریا کنارے سدھارتھ وقت کی حقیقت جان لیتا ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت جان جاتا ہے۔ اور یہی آگہی اس ناول کی انتہا ہے، یہیں پر اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہرمن ہیسے کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یوں تو فلسفیانہ ناول بیسویں صدی میں بہت سے لکھے گئے ہیں مگر اس ناول کی حیثیت جداگانہ ہے۔

آصف فرخی: میرے خیال میں تو اس ناول کو ہیسے کی تمام تصانیف میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ہیسے بھی کمال کا لکھنے والا ہے۔ شروع میں وہ رومانی شاعری کے انداز میں ڈوبے ہوئے ناول لکھتا ہے جن میں آوارگی اور فطرت پرستی شامل ہیں، کہیں ہندوستان کا سفر کرتا ہے، کہیں منشیات کا تجربہ کرتا ہے، کہیں تحلیل نفسی تک جا پہنچتا ہے اور اپنے آخری ناول ''گلاس بیڈ گیم'' میں تو دیدہ بینا کو واقعی لڑکوں کا کھیل بنا دیتا ہے۔ اس کی بعض کتابیں اپنے قارئین کو بہت حیران کرتی ہیں۔ مثلاً ''مشرق کا سفر'' جو ناول ہے اس میں ابتدائی حصہ پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ آگے کوئی بہت گہرا اور اہم راز حاصل ہوگا، مگر ہوتا کچھ نہیں۔ پھر بھی آج کے انسان کے وسائل ہیں اور جو مطالبات ہیں ان کو.....

سلیم احمد: بات یہ ہے آصف کہ فلسفیانہ مسائل تو بہت سے ناول نگاروں کے ہاں آئے ہیں اور دوستوئیفسکی کے ہاں جو چیزیں جس انداز سے آئی ہیں ان کی مثال تو ممکن ہی نہیں، پھر خود ہرمن ہیسے کے دوست اور معاصر تھامس مان کے فکشن میں ایک فکری جہت موجود ہے۔ جیسے کے اس ناول میں مجھے سب سے اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ فکر اور فلسفہ کہانی کے سماجی اور معاشرتی پس منظر کا محض ایک حصہ نہیں ہے۔ لیکن اس میں دقت یہ ہے کہ وہ ذاتی تجربے کے ذریعے سے پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہی تو انہیں کہیں پہنچنے نہیں دیتا۔ وہ ایک مقام یا منزل تک جاتے ہیں پھر بھٹک جاتے ہیں کیونکہ وہ کلام خداوندی کی رہنمائی نہیں قبول کرتے۔ اصل میں قصہ یہ ہے آصف کہ مغرب کو تباہ کیا ہے اس کے اتھارٹی سے انکار نے۔ اس کے مذہب کو، اس کے اخلاق کو، اس کی سیاست کو، اسکی معاشرت کو، ہر چیز کے پیچھے اتھارٹی کا انکار ہے۔ اور اس اتھارٹی کو نہ ماننے کے سبب سے سارا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ اور جس وقت تک وہ اتھارٹی کو نہیں مان لیں گے، یعنی نبی کو نہیں مان لیں گے، مذہب کی بنیاد کو نہیں مان لیں گے، اس چیز کو قبول

نہیں کریں گے جوان کے نفس سے باہر ہے،اس وقت تک فراق میں مبتلا رہیں گے، ڈور کا سرا انہیں نہیں ملے گا۔
آصف فرخی: سدھارتھ سے ایک چیز اور سامنے آتی ہے:وہ ہے مشرق سے مغرب کا Fascination یعنی اپنے تمام تر برتری کے زعم کے باوجود، سائنسی اور تکنیکی مہارت، سیاسی اور اقتصادی قوت کے باوجود مشرق کی طرف دیکھتے ہیں،انہیں موجود ہے۔ہاں، یہ اور بات ہے کہ اس میں مشرق کے نام پر جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ مغربی افکار کی بازگشت ہے۔پھر بھی میں ہیسے کو اس بات کا کریڈٹ دوں گا کہ اس نے مشرق کی آواز کو سننے کی کوشش تو کی ہے،ان نام نہاد مستشرقین کی طرح نہیں جن کی بے مائیگی کی پول ایڈورڈ سعد نے اپنی کتاب میں کھول دیئے ہے۔
اور پھر سلیم صاحب بات یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کا روایتی فرق بعض مقامات پر ثانوی اہمیت رکھتا ہے، کیوں کہ زندگی کی معنویت کی تلاش ،منزل کی جستجو ، کائنات کے روحانی مرکز کو جان لینے کی خواہش ایسی باتیں ہیں جن میں مشرق ومغرب کی تخصیص بعد کی بات ہے۔اور طریقے جدا ہوں تو ہوں منزل تو ایک ہے۔ہرمن ہیسے نے سدھارتھ میں مشرق ومغرب دونوں کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی ہے۔
سلیم احمد: میں نے اس کے لئے لفظ استعمال کیا غیر روایتی۔یہ جو طرز فکر ہے یہ غیر روایتی ہے، روایت کا مخالف ہے۔اور اس فکر کا آدمی مشرق سے کچھ سیکھ ہی نہیں سکتا۔مشرق کی بنیاد تو روایت پر ہے اور روایت کی بنیاد اتھارٹی پر ہے۔ایک کتاب ہوگی ،ایک نبی ہوگا،ایک صاحب مذہب ہوگا،ایک صاحب سلسلہ ہوگا جس کی خبر پر آپ کو اسے Follow کرنا ہے،اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی بسر کرنی ہے۔اس کو شریعت کہتے ہیں۔اس کے بغیر آپ کوئی روحانی ترقی نہیں کر سکتے نہ آپ کچھ پا سکتے ہیں بلکہ اسکے بغیر عرفان نفس یا آگہی آپ کو دراصل گمراہی کی طرف لے جائے گی۔
آصف فرخی:مگر سدھارتھ کو تو وہ آگہی حاصل ہوگئی۔
سلیم احمد: جی ،ناول میں۔
آصف فرخی:مگر ناول زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔
سلیم احمد: نہیں، یہ ناول زندگی کا عکاس نہیں، یہ انکے خیالات کا عکاس ہے۔یہ جو کہتے ہیں کہ اس راستے سے وہ اس منزل تک پہنچ گیا،تو اس پر میں نے پہلے ہی اعتراض کر دیا کہ اسکے پیچھے وہ روایت موجود نہ ہوتی تو وہ اوم کے لفظ تک نہ پہنچتا،اس وحدت کے تجربے تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔
آصف فرخی: واسودیو کا جو کردار ہے اس میں ایک قسم کی Folk wisdom ہے۔اور چوں کہ سدھارتھ کو عرفان حقیقت اسی کے وسیلے سے ہوا ہے،تو گویا ناول میں اس کی فتح ہوئی ہے۔واسودیو کا کردار کچھ زیادہ ہی نیک اور سادہ ہے۔وہاں پر ناول کچھ ہلکا پڑ جاتا ہے۔
سلیم احمد: لیکن مجموعی طور پر اس ناول کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔میں تو اس ناول کو اس صدی کی بہت اہم فکری اور فنی دستاویز سمجھتا ہوں۔یہ جن مسائل کو چھیڑتا ہے وہ اس عہد کے بہت اہم مسائل ہیں۔اور میں تمہیں بتاؤں کہ یہ ناول جب میں نے پہلی بار پڑھا تو میری کیا کیفیت ہوئی۔اسکے بعد سے میں نے اس ناول کو نہ جانے کتنی بار پڑھا ہے۔
آصف فرخی: یہی حال میرا بھی ہوا۔یہ ناول میرے دل و دماغ پر چھا گیا۔میں اس سے لطف اندوز بھی ہوا اور اسکو فکر انگیز بھی پایا،لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب میں نے یہ ناول پڑھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ یہ ناول میری اپنی واردات ہے، یہ میرا تجربہ بنتا گیا، میں نے اس میں اپنی کشمکش اور اپنی کہانی پڑھی۔اسی لئے اس کو ترجمہ کرنے کا خیال آیا۔
سلیم احمد: میں نے تمہارا ترجمہ پڑھا۔مجھے پسند آیا۔تم اس کتاب کو گرفت میں لے آئے ہو۔ایک آدھ جگہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم اسکی شدت کو نہیں پا سکے۔میری دانست میں یہ کتاب مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔میں اسے جدید ادب کی کلیدی کتابوں میں سے ایک سمجھتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تمہارا یہ ترجمہ بھی اسی کامیابی سے ہمکنار ہو۔
(ستمبر۱۹۸۲ء)

ہرمن ہیسے

آصف فرخی

ہرمن ہیسے کا شمار اس صدی کے اہم ترین اور سربرآوردہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔یہ بے مثال کہانی کار،شاعر اور مفکر ۱۸۷۷ء میں جرمنی کے قصبے CALW میں پیدا ہوا۔اس کا گھرانا راسخ العقیدہ پادریوں اور راہبوں کا گھرانا تھا، اور ہیسے کی تربیت بھی اسی تصور کے مطابق ہوئی کہ وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے راہب بنے گا۔لیکن ہیسے نے نوعمری ہی میں اپنے خاندان کی کٹر روایات اور نظام تعلیم کے خلاف بغاوت کر دی۔۱۸۹۱ء میں وہ اپنی

درس گاہ سے بھاگ نکلا، اور ادھر ادھر بھٹکتا پھرا، اس دوران ایک عالم نے اس کا روحانی علاج کرنا چاہا۔ہیسے نے خودکشی کرنے کی کوشش بھی کی، جو روحانی علاج کی طرح ناکام رہی۔آخر کار وہ ایک کتاب فروش کے ہاں ملازم ہو گیا۔اس کا پہلا ناول ''پیٹر کیمن زنڈ'' ۱۹۰۴ء میں چھپا، اور دوسرا ناول ۱۹۰۶ء میں۔یہ دونوں ناول ایسے نوجوانوں کی کہانیاں ہیں، جن کی مضطرب روحوں کو کسی نامعلوم شے کی جستجو ہے، ایسی تلاش جس میں انکا ماحول، معاشرہ اور مروجہ نظام تعلیم مدد دینے کے بجائے رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں، اور ان کرداروں کو اپنی لگن کی سچائی اور جستجو کی تکمیل کی خاطر ان اقدار سے ٹکرانا پڑتا ہے، چاہے اس ٹکراؤ کی قیمت انہیں اپنی جان دے کر ہی کیوں نہ چکانی پڑے۔ان ناولوں میں آپ بیتی کا عنصر خاصا شامل تھا کہ ہرمن ہیسے کو خود اپنی زندگی میں بھی یہی جستجو تھی، اور اسی تلاش میں اس نے ۱۹۱۱ء میں ہندوستان کا سفر کیا۔اس زمانے میں جرمنی میں عسکریت اور جنگی جنون بڑھتا جا رہا تھا، اور بالآخر یہ پہلی جنگ عظیم کا پیشہ خیمہ ثابت ہوا۔ہیسے کو اس جنگ سے شدید ذہنی صدمہ پہنچا اور وہ فرانسیسی ادیب روماں رولاں کی امن تحریک میں شامل ہو گیا۔اس نے صحافیانہ مضامین لکھے اور اخباروں کی ادارت سنبھالی، پھر جنگ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر لی۔جرمنی کی شہریت سے دست بردار ہو کر وہ سوئٹزرلینڈ کا شہری بن گیا۔یہ زمانہ ہیسے کے لئے کئی طرح سے ہیجان خیز ثابت ہوا۔روحانیت اور سکون کی تلاش میں وہ مشرق کا سفر بھی کر چکا تھا اور دوسری طرف اس کی ازدواجی زندگی بھی ناکام ہو چکی تھی۔اسی زمانے میں ہیسے نے فرائڈ کی نفسیات کا مطالعہ کیا، اور ژونگ کے ایک شاگرد سے اپنا نفسیاتی تجزیہ بھی کروایا۔علم نفسیات نے انسانی لاشعور کا جو گم شدہ تاریک براعظم دریافت کیا، اس نے یورپ کے دانشوروں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا، ہیسے بھی ان تعلیمات سے متاثر ہوا۔روحانیت کی تلاش، نفسیاتی پیچیدگیاں، سکون آور دوائیں، تکمیل کی آرزو اور انفرادیت پسندی بچوں خاص اس کے فن پر اثر انداز ہوئیں اور جب ۱۹۱۹ء میں اس کا ناول Demian شائع ہوا تو اس نے سارے یورپ میں دھوم مچا دی۔۱۹۲۲ء میں ''سدھارتھ'' شائع ہوا اور ۱۹۲۳ء میں ناول ''مشرق کا سفر'' ہیسے نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا کہ میری ذہنی نشوونما میں قدیم ہندوستانی اور چینی تہذیبوں کے مطالعے کا حصہ عیسائیت کے مطالعے سے زیادہ ہے۔۱۹۲۷ء میں اس کا مشہور ناول Stephen wolf شائع ہوا۔''اسٹیپن ولف'' ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس کی ذات حیوان اور انسان کے درمیان کشمکش کی آماجگاہ بن گئی ہے، ایک طرف وہ ایسی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے جو معاشرے کے لئے قابل قبول ہو، جب کہ اس کی حیوانی جبلت اسے دوسری طرف لئے جاتی ہے۔۱۹۳۰ء میں ناول Narziss & Goldmund شائع ہوا۔اس ناول کے کردار ازمنہ وسطیٰ کے دو راہب ہیں، جو دراصل انسان کے دو چہرے، ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں، نارزس عالم ہے، گوشہ گیری اور تنہائی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے، اور گولڈمنڈ دنیا کا پجاری ہے، ان دونوں کی کہانی دراصل انسانیت کی تمثیل ہے جس کے اندر یہ دونوں رجحانات نہ صرف موجود ہیں بلکہ برسرپیکار بھی رہتے ہیں۔دوسری جنگ عظیم کے دوران نازی جرمنی میں اس کی تمام کتابوں پر پابندی لگا دی گئی بلکہ ان کتابوں کے نسخے کتب خانوں سے نکال کر سڑکوں پر نذر آتش کئے گئے۔اس وقت تک ہیسے کی شہرت مستحکم ہو چکی تھی۔اس کی انسان دوستی، اس کی فکری جستجو، اس کے ناول اور افسانے، غنائی نظمیں اور فکر انگیز مضامین قارئین کے بہت بڑے حلقے میں مقبول ہو چکے تھے۔۱۹۴۳ء میں اس کا آخری ناول ''شیشے کی گولیوں کا کھیل'' منظر عام پر آیا۔ایک فرضی شخص کے سوانح کے انداز میں لکھا ہوا یہ طنزیہ ناول انسان کی آفاقیت، تہذیب، تصورات اور انفرادی طور پر تکمیل حاصل کرنے کی خواہش کی کہانی ہے۔۱۹۴۶ء میں ہیسے کو ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔اس کے بعد ہیسے نے کوئی اور ناول نہیں لکھا، کبھی کبھار نظمیں اور مضامین لکھنے کے علاوہ، وہ سوئٹزرلینڈ کے ایک قصبے میں خاموش زندگی گزارتا رہا اور یہیں ۱۹۶۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔اسکی تصانیف دنیا کی کئی زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔اردو میں اس کی چیدہ چیدہ نظمیں اور کہانیاں ترجمہ ہوئی ہیں، اور اس ناول کا ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اور اب نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔

©۔جملہ حقوق بحق ادارہ اُردو پوائنٹ محفوظ ہیں۔
(C)-www.UrduPoint.com